رجب المرجب ۱۴۴۴ھ
فروری ۲۰۲۳ء

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دین کے تقاضے: عملی لائحہ عمل

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعئ رجوع الی القرآن بانئ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل ● عمدہ سفید کاغذ ● معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط ● تفسیری سائز ● مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدة:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 72

شمارہ : 2

رجب المرجب 1444ھ

فروری 2023ء

فی شمارہ : 50 روپے

سالانہ زرِتعاون : 500 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ’’دارالاسلام‘‘ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

مذہبی سیاسی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام

ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ المعارج

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ — 23

دین کے تقاضے: عملی لائحۂ عمل

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت — 53

عفو و درگزر

شعبہ تربیت تنظیم اسلامی

انوارِ ھدایت — 61

رسول اللہ ﷺ کا مثالی اندازِ تعلیم

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اقبالیات — 67

اقبال کا مردِ مؤمن

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

مذہبی سیاسی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام

ایک عام تأثر یہی ہے کہ پاکستان اور اسرائیل دونوں مذہبی نظریاتی ریاستوں کے طور پر عالمی نقشہ پر نمودار ہوئے‘ لیکن کسی بھی غیر جانبدار مبصر اور تجزیہ نگار کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی کسی ریاست کی تعریف پر صرف پاکستان ہی پورا اُترتا ہے۔ اسرائیل تو حقیقت میں ایک نسلی ریاست ہے۔ افسوس کہ آج پاکستان بھی ایک ایسی سیکولر ریاست دکھائی دیتی ہے جسے محض رسمی طور پر اسلامی ٹچ دیا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں آج کہیں بھی کوئی حقیقی جدید اسلامی فلاحی ریاست دور دور تک نظر نہیں آتی۔ نہ بادشاہت تلے دبے اُس عرب میں جو اسلام کی جنم بھومی ہے‘ نہ اُس ایران میں جہاں بادشاہت کے خاتمے والے اسلامی انقلاب کا دنیا میں بڑا چرچا ہوا تھا‘ اور نہ ہی اُس افغانستان میں جہاں دنیا بھر کی فوجوں کو عبرتناک شکست دینے کے بعد ابھی تک روایات اور جدید تقاضوں کے درمیان راہِ اعتدال تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش ہو رہی ہے۔ البتہ ہماری اوّلین فکر پاکستان کے حوالے سے ہونی چاہیے جو ۱۹۴۷ء میں اپنا مطلب ’’لا الٰہ اِلّا اللّٰہ‘‘ بتاتے ہوئے وجود میں آیا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد اور ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ علماء کے ۲۲ نکات پر مشتمل ایک متفقہ دستاویز کی منظوری سے قرآن و سُنّت کے نظام کو عملی شکل دینے کے لیے پیپر ورک مکمل ہو گیا۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ ملک روز بروز اسلام سے دور کیوں ہوتا گیا!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکی اور بین الاقوامی سازش کے نتیجے میں لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا اور انگریز کی تیار کردہ سول سروس اور ملٹری بیوروکریسی نے جاگیردار سیاست دانوں کی مدد سے اسلام کی گاڑی کا رخ سیکولرازم کی طرف موڑ دیا‘ لیکن اصل بدقسمتی اسلام کے نام لیواؤں کی ناقص کارگزاری تھی۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مذہبی و دینی جماعتوں کو چاہیے تھا کہ قومی قیادت سے بے جا

مغائرت کی بجائے اس کے مخلص اور مذہبی جذبہ رکھنے والے لوگوں سے تعاون کے ذریعے ان کو تقویت دیتے۔ آپس کے انتشار کو چھوڑ کر اتفاق اور تعاون کے ساتھ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق تعمیری جِدّ وجُہد میں لگ جاتے۔ افسوس کہ معاملہ برعکس بلکہ خراب تر ہوتا چلا گیا۔ قال اللہ وقال الرسول ﷺ پر مشتمل بنیادی مگر روایتی علم کے حقیقی وارثین کا ایک بڑا طبقہ زندگی کے نئے تقاضوں اور دنیا کے جدید فتنوں سے بے خبر آپس کی پرانی بحثوں میں مشغول رہا۔ ساری ذہنی‘ فکری صلاحیتیں اپنے مسلک کو برحق ثابت کرنے پر لگتی رہیں۔ اہل حکومت سے دُوری بھی برقرار رہی۔ اصل تباہی تب آئی جب مختلف فرقوں کی طرف سے سیاسی حریف بن کر انتخابی سیاست میں کودنے کا عمل شروع ہوا۔ علماء نے اپنے اپنے مسلک کی ٹریڈ یونینز کی طرح کا رویہ اختیار کر لیا اور اسلام کے علمبردار بننے کی بجائے اسلام آباد کے امیدوار بن گئے۔ یوں ایک طرف تو اہلِ مذہب کی باہمی فرقہ واریت اور بدنامی بڑھتی چلی گئی جبکہ دوسری طرف سیکولر اور لبرل طبقات کو کھل کر اسلام کو بدنام کرنے کا پورا موقع میسّر آیا۔

وہ جماعت جو مسٹر و مولوی‘ کالج و مدرسہ اور جدید و قدیم کے درمیان معتدل امتزاج پیدا کرتے ہوئے علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی میدان میں دینی اقدار کے احیاء کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی تھی‘ اس کا طرزِ عمل بھی دانشمندانہ دکھائی نہ دیا۔ اسے اپنے اسی فطری طریقے پر کاربند رہنا چاہیے تھا جس پر وہ قیامِ پاکستان سے قبل تھی۔ پہلے دعوت کے ذریعے افراد کی فکری و علمی تربیت ہوتی۔ پھر ایسے افراد مل کر اخلاقی و عملی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر احیاء اسلام کی کوشش کرتے۔ حکومت کے ساتھ مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے تعاون کی فضا قائم کی جاتی جس کا موقع قائدِ اعظمؒ نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیا۔

یہ جماعتیں جب انتخابی میدان میں اُتریں تو انہوں نے سمجھا کہ جیسے اسلام کے نام پر پاکستان حاصل ہو گیا تھا اسی طرح اب اسلام کے نام کی محض قوالی کر کے یہاں اقتدار بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ محض ایک خوش فہمی تھی۔ اس لیے کہ اسلام کے نام پر جس عوام نے ووٹ دینا تھا اُسے اس حوالے سے ذہنی طور پر تیار نہ کیا گیا۔ ایمان کی ایسی آبیاری نہ کی گئی کہ لوگ دنیا پر آخرت کو ترجیح دیں۔ نہ اسلامی فلاحی ریاست کا ایسا نقشہ پیش کیا گیا کہ جس میں اسلام کے تعزیراتی پہلو کے بجائے عدل و قسط کا نظام نمایاں ہوتا۔ بتایا جاتا کہ یہ انسانی خدمت کا نظام

ہے۔ ظالم سے مظلوم کا حق واپس دلانے کا نظام ہے۔ آجر اور مستأجر‘ مزدور اور سرمایہ دار‘ مرد اور عورت میں عادلانہ توازن کا نظام ہے۔ اُن کے سامنے مثالی کردار بھی پیش نہ کیا گیا‘ صرف کھوکھلے نعروں پر تکیہ کیا گیا۔

بات یہاں تک آ پہنچی کہ انتخابات میں جو طور طریقے دوسری سیاسی جماعتوں کے تھے وہی مذہبی سیاسی جماعتوں نے بھی اپنا لیے۔ حیرت ہے کہ ان کے ذمہ داران کھلم کھلا یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمیں انتخابات میں حصہ لینا ہے تو پھر وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو مروجہ سیاسی نظام میں ہوتا ہے۔ شاید وہ اب دھاندلی کی بھی وکالت کر رہے ہیں۔ آج کا پڑھا لکھا نوجوان یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ تحریک نظام مصطفیٰؐ کا انجام بھی اُن کے سامنے ہے۔ عوام نے اسلام کے نام پر جان و مال کی بے دریغ قربانی دی لیکن پھر مذہبی سیاسی جماعتوں نے سول آمریت کو ختم کر کے فوجی آمریت کو قبول کر لیا۔ کے پی کے میں ایم ایم اے کو اقتدار ملا تو اِن میں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے طرزِ حکومت میں کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔ صوبے میں اسلامائزیشن کی جِدّوجُہد کو بھول گئے۔ جب اگلا الیکشن سر پر آیا تو ایک ’’حسبہ بل‘‘ لے آئے جس کا سر پیر ہی نہیں تھا‘ لہٰذا عدالت نے اُسے ناقابلِ عمل قرار دے دیا۔ آئین میں سترہویں ترمیم لاتے وقت مشرف کی بالواسطہ مدد کی‘ جس سے فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔ ’’تحفظِ نسواں بل‘‘ اسمبلی میں آیا تو اُس کی مخالفت کرنے کی بجائے واک آؤٹ کیا۔

۲۸/اپریل ۲۰۲۲ء کو وفاقی شرعی عدالت نے ربا کی حرمت کا فیصلہ دیا تو جس حکومت نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی اُس میں ملک کی ایک بڑی مذہبی سیاسی جماعت بھی شامل ہے۔ وہ جماعت اگر حکومت کو سپورٹ دینے سے انکار کر دے تو موجودہ حکومت چند گھنٹے نہیں نکال سکتی۔ حکومت سود کو جاری رکھنے کے لیے مختلف حربے اختیار کر رہی ہے اور وہ جماعت حکومت کا ستون بنی ہوئی ہے۔ کراچی کے حالیہ بلدیاتی انتخابات میں ایک مذہبی سیاسی جماعت نے میڈیا کے ذریعے جو انتخابی مہم چلائی وہ دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ گویا مذہبی سیاسی جماعتوں نے بہت سے ایسے کام کیے جس سے اُن میں اور دوسری سیاسی جماعتوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دوسری جماعتوں پر الزام تھا کہ وہ جلسوں میں گانا بجانا کرتے ہیں‘ گھٹیا اور فحش زبان استعمال کرتے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتیں اس معاملے میں

بھی اُن پر سبقت لے جانا چاہتی ہیں۔ ۱۴/اگست ۲۰۲۲ء کو حکومتی پارٹی نے ناچ گانے کی جو سرکاری محفل سجائی اُس کو ایک مذہبی سیاسی جماعت کے وزراء نے پورے انہماک سے ملاحظہ کیا۔ ایک مذہبی رہنما نے جلسہ میں فحش گفتگو کرنے میں ''ٹاپ'' کیا اور ایسی زبان استعمال کی کہ اُس کو دہرایا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر مذہبی سیاسی جماعتیں یہ توقع رکھیں گی کہ عوام ہمیں ووٹ دے کر اقتدار پر فائز کر دیں گے تو یہ بڑی خوش فہمی ہے۔ ان کے لیے یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ ہے۔

اگر مذہبی سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصّہ لینا ناگزیر سمجھتی ہیں تو اُنہیں فوری نتائج سے بے پرواہ ہو کر عوام کی ذہنی اور فکری تبدیلی کے لیے بھرپور کام کرنا ہوگا۔ عوام کے اذہان میں یہ بات راسخ کرنا ہوگی کہ پاکستان اگر اسلامی فلاحی ریاست کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اُن کی دنیا اور آخرت دونوں سنوریں گی۔ ذرا اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالیں! ایک طرف اسلامی ریاست کئی براعظموں پر محیط تھی تو دوسری طرف مستحقین زکوٰۃ ڈھونڈے سے نہیں ملتے تھے۔ عدل وقسط کا یہ عالَم تھا کہ قاضی خلیفہ وقت کے خلاف فیصلے دینے سے نہیں جھجکتے تھے۔ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ پاکستان کی دنیوی اور اُخروی کامیابی کے لیے اپنا تَن مَن دھن لگا دیں تاکہ رہبری اور رہنمائی کا حق ادا ہو سکے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین! ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

دورۂ ترجمۂ قرآن — ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ

سورۃ المعارج تین سورتوں پر مشتمل دوسرے ضمنی گروپ کی پہلی سورت ہے۔ اس گروپ میں پہلی دو سورتیں یعنی سورۃ المعارج اور سورۂ نوح جوڑے کی شکل میں ہیں' جبکہ تیسری سورت (سورۃ الجن) منفرد ہے۔

آیات ۱ تا ۳۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍۙ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌۙ ﴿۲﴾ مِّنَ
اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِؕ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍۚ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ
يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًاۙ ﴿۶﴾ وَّ نَرٰىهُ قَرِيْبًاؕ ﴿۷﴾ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ
كَالْمُهْلِۙ ﴿۸﴾ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِۙ ﴿۹﴾ وَ لَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ
حَمِيْمًاۚۖ ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ
يَوْمِىِٕذٍۭ بِبَنِيْهِۙ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِۙ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِۙ ﴿۱۳﴾
وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًاۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِۙ ﴿۱۴﴾ كَلَّاؕ اِنَّهَا لَظٰىۙ ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً
لِّلشَّوٰىۚۖ ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَ تَوَلّٰىۙ ﴿۱۷﴾ وَ جَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ
الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاۙ ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاۙ ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ
الْخَيْرُ مَنُوْعًاۙ ﴿۲۱﴾ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَۙ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
دَآىِٕمُوْنَۖ ﴿۲۳﴾ وَ الَّذِيْنَ فِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌۖ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآىِٕلِ وَ

الْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ
مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾

آیت ۱، ۲ ﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾﴾ ’’مانگا ایک مانگنے والے نے ایک ایسا عذاب جو واقع ہونے والا ہو‘ کافروں کے لیے‘ جس کو کوئی ٹال نہ سکے گا۔‘‘

یہاں سَاَلَ سَآئِلٌ سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ میری رائے بہت پہلے سے یہ تھی کہ یہ عذاب طلب کرنے والے خود حضور ﷺ ہیں‘ لیکن مجھے اپنی رائے پر اطمینان اُس وقت ہوا جب مجھے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ عام مفسرین میں سے بہت کم لوگ شاہ صاحبؒ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس آیت میں حضور ﷺ کی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے دراصل اُس دور کا نقشہ ذہن میں لانا ضروری ہے جب حضور ﷺ پر ہر طرف سے طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مکّہ کی گلیوں میں آپؐ کو شاعر‘ مجنون‘ ساحر اور کذّاب جیسے ناموں سے پکارا جا رہا تھا (معاذ اللہ)۔ اعلانِ نبوت کے بعد تین سال تک تو یوں سمجھیے کہ پورے شہر کی مخالفت کا نشانہ صرف حضور ﷺ کی ذات تھی۔ مشرکین کا خیال تھا کہ اگر وہ آپؐ کی قوّتِ ارادی اور ہمت توڑنے یا کسی بھی طریقے سے آپؐ کو آپؐ کے موقف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس دور میں عام اہلِ ایمان کو نظر انداز کر کے صرف آپ ﷺ کی ذات کو نشانے پر رکھا گیا تھا۔ اس دوران اگرچہ آپؐ کو کوئی جسمانی اذیت تو نہ پہنچائی گئی لیکن باقاعدہ ایک منظّم مہم کے تحت آپ ﷺ کے خلاف ذہنی‘ نفسیاتی اور جذباتی تشدّد کی انتہا کر دی گئی۔ ان لوگوں کی اس مذموم

مہم کی وجہ سے حضورﷺ مسلسل ایک کرب اور تکلیف کی کیفیت میں تھے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ اور جملوں سے بھی ہوتا ہے جو اُس دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں آپؐ کی تسلی کے لیے جگہ جگہ آئے ہیں۔

بہرحال حضورﷺ بھی تو آخر انسان تھے۔ مسلسل شدید ذہنی اذیت کا سامنا کرتے ہوئے ردِعمل کے طور پر آپؐ کے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کہ اب ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جانا چاہیے۔ چنانچہ ان آیات میں آپﷺ کی اسی خواہش یا دعا کا ذکر ہے۔ اس حوالے سے یہاں یہ نکتہ بھی مدِنظر رہے کہ اس سورت کا سورۂ نوح کے ساتھ جوڑے کا تعلق ہے اور سورۂ نوح میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جس میں آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے سخت عذاب مانگا تھا۔ گویا ان دونوں سورتوں کے اس مضمون کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق میں یہ مناسبت بھی بہت اہم ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول اور حضورﷺ آخری رسول ہیں۔(1)

آیت ۳ ﴿مِّنَ اللّٰهِ ذِی الۡمَعَارِجِ ۝۳﴾ ’’(وہ عذاب اپنے وقت پر آئے گا) اُس اللہ کی

۱۔ اس مقام پر جمہور مفسرین کی رائے حضرت شاہ صاحب اور محترم ڈاکٹر صاحب رحمہما اللہ کی رائے سے مختلف ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں ’’سَاَلَ‘‘ کو دریافت کرنا کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ وہ عذاب جس کی ہمیں خبر دی جا رہی ہے، کن لوگوں پر نازل ہوگا؟ تو اُس سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ کُفار پر نازل ہوگا اور جب نازل ہوگا تو کوئی اس کو ٹال نہیں سکے گا۔ لیکن اکثر مفسرین نے اس جگہ ’’سَاَلَ‘‘ کو مانگنے اور طلب کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک ان الفاظ میں نضر بن حارث کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو سورۃ الانفال میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ﴿اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَـقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۳۲﴾ ’’اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری ہی طرف سے برحق ہے تو برسا دے ہم پر پتھر آسمان سے یا بھیج دے ہم پر کوئی دردناک عذاب۔‘‘

مزید برآں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر کُفارِ مکہ کے اس چیلنج کا ذکر کیا گیا ہے کہ جس عذاب سے آپ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں وہ لے کیوں نہیں آتے! اس مطالبے کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ عذاب کُفار کے لیے تیار ہے، وہ ضرور انہیں چکھایا جائے گا، لیکن اپنے وقت پر۔ اور جب وہ مقررہ گھڑی آ جائے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اس عذاب کو ٹال نہیں سکے گی۔ (حاشیہ از مرتّب)

طرف سے جو بہت بلند درجات والا ہے۔‘‘

آیت ۴ ﴿تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ﴿۴﴾﴾ ’’چڑھتے ہیں فرشتے اور روح اُس کی جانب ایک دن میں جس کی مقدار پچاّس ہزار برس ہے۔‘‘

یہ آیت ہمارے لیے آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ بعض مفسّرین کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے ’’ذِی الۡمَعَارِجِ‘‘ ہونے کی وضاحت ہے کہ اُس کی بارگاہِ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریلؑ کو بھی پچاس ہزار سال کی مسافت کے برابر فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ پچاس ہزار برس کے دن سے یہاں قیامت کا دن مراد ہے جو کُفّار کے لیے تو بہت طویل اور سخت ہوگا‘ البتہ اہل ایمان کو وہ دن ایسے محسوس ہوگا جیسے انہوں نے دن کا کچھ حصّہ یا ایک فرض نماز ادا کرنے کے برابر وقت گزارا ہو۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّہٗ لَیُخَفَّفُ عَلَی الْمُؤْمِنِ حَتّٰی یَکُوْنَ اَھْوَنَ عَلَیْہِ مِنْ صَلَاۃٍ مَکْتُوْبَۃٍ یُصَلِّیْھَا فِی الدُّنْیَا)) ’’اُس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! یہ دن مؤمن کے لیے بہت مختصر کر دیا جائے گا‘ یہاں تک کہ جتنے وقت میں وہ دنیا میں ایک فرض نماز ادا کرتا ہے اس سے بھی اسے مختصر معلوم ہوگا۔‘‘

آیت ۵ ﴿فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۵﴾﴾ ’’تو آپؐ بڑی خوبصورتی سے صبر کیجیے۔‘‘

یہ ہے وہ اصل پیغام جو ان آیات کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دینا مقصود تھا‘ کہ ابھی تو سفر کا آغاز ہوا ہے‘ آنے والا وقت اور بھی کٹھن ہوگا۔ لہٰذا آپؐ اپنے راستے میں آنے والی ہر مشکل کا صبر اور استقامت کے ساتھ سامنا کریں۔ اس سے پہلے سورۃ القلم میں بھی آپؐ کو ایسی ہی ہدایت کی گئی ہے: ﴿فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ۘ﴾ (آیت ۴۸) ’’تو آپؐ انتظار کیجیے اپنے رب کے حکم کا‘ اور دیکھئے! آپؐ اُس مچھلی والے کی طرح نہ ہوجایئے گا!‘‘

آیت ۶، ۷ ﴿اِنَّہُمۡ یَرَوۡنَہٗ بَعِیۡدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىہُ قَرِیۡبًا ؕ﴿۷﴾﴾ ’’یہ لوگ تو اس (عذاب) کو دور سمجھ رہے ہیں‘ اور ہم اسے نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔‘‘

ظاہر ہے انسان تو صرف اپنے سامنے کی چیز کو ہی دیکھ سکتا ہے‘ مستقبل میں جھانکنا تو اس

کے بس میں نہیں ہے۔ اسی لیے مستقبل کی چیزیں یا خبریں اسے عام طور پر دور محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تو مستقبل وغیرہ کچھ نہیں اور نہ ہی کوئی چیز اس سے غائب ہے۔ وہ تو ہر چیز کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک شخص صرف اسی شہر یا مقام کو دیکھ سکتا ہے جو اُس کے سامنے ہے جبکہ اس سے اگلا شہر مستقبل میں ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہے وہ ان دونوں شہروں کو بیک وقت اپنے سامنے دیکھ سکتا ہے۔ بقول آئن سٹائن every thing is relative کہ دنیا کی ہر چیز کسی دوسری چیز سے متعلق ومشروط ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز یا صورتِ حال کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھ کر کوئی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔ دنیا میں ہمارے اعتبار سے بھی قریب اور بعید relative ہیں‘ جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی شے بھی بعید نہیں‘ ہر چیز اُس کے سامنے ہے۔ ماضی‘ حال اور مستقبل آنِ واحد میں اُس کے سامنے موجود ہیں۔

آیت ۸ ﴿یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ کَالۡمُہۡلِ ۙ﴿۸﴾﴾ ’’جس دن آسمان ہو جائے گا جیسے پگھلا ہوا تانبا۔‘‘

آیت ۹ ﴿وَ تَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِہۡنِ ۙ﴿۹﴾﴾ ’’اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی (یا رنگی ہوئی اُون)۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿وَ لَا یَسۡـَٔلُ حَمِیۡمٌ حَمِیۡمًا ﴿۱۰﴾ۚۖ﴾ ’’اور کوئی دوست کسی دوسرے دوست کا حال نہیں پوچھے گا۔‘‘

آیت ۱۱ تا **۱۴** ﴿یُّبَصَّرُوۡنَہُمۡ ؕ﴾ ’’وہ سب انہیں دکھائے جائیں گے۔‘‘

وہاں مشکل میں پھنسے ہوئے ہر شخص کو اُس کے دوست احباب‘ والدین‘ بیوی بچے غرض اس کے سب پیارے دکھا بھی دیے جائیں گے تا کہ اس کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

﴿یَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ یَفۡتَدِیۡ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِئِذٍۭ بِبَنِیۡہِ ﴿ۙ۱۱﴾ وَ صَاحِبَتِہٖ وَ اَخِیۡہِ ﴿ۙ۱۲﴾ وَ فَصِیۡلَتِہِ الَّتِیۡ تُــٔۡوِیۡہِ ﴿ۙ۱۳﴾ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ۙ ثُمَّ یُنۡجِیۡہِ ﴿ۙ۱۴﴾﴾

’’مجرم چاہے گا کہ کاش وہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو‘ اور اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو‘ اور اپنے کنبے کو جو اسے پناہ دیتا تھا‘ اور روئے

زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو‘ پھر یہ (فدیہ) اس کو بچا لے!‘‘

یہ اس کیفیت کی ایک جھلک ہے جس کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس روز نفسانفسی کا عالم ہوگا۔ ہر شخص کو اپنی فکر ہوگی اور وہ چاہے گا کہ خواہ اس کے بیوی بچوں اور عزیز واقارب سمیت سب کو عذاب میں جھونک دیا جائے لیکن اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کیفیت کا بالکل ایسا ہی نقشہ سورۂ عبس کی ان آیات میں بھی دکھایا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝٣٤ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝٣٥ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝٣٦ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝٣٧﴾ ’’اُس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے‘ اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے‘ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ اُس دن ان میں سے ہر انسان کی ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے خبر کر دے گی‘‘۔ احادیث میں آتا ہے کہ اُس روز اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ﷺ بھی نَفْسِیْ نَفْسِیْ پکار رہے ہوں گے۔

آیت ۱۵ ﴿كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝١٥﴾ ’’ہرگز نہیں! اب تو یہ بھڑکتی ہوئی آگ ہی ہے۔‘‘

آج تم سے نہ تو کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا‘ اور نہ ہی کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ آج جہنّم کی اس شعلہ فشاں آگ کا سامنا تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی اس آیت میں واضح کیا گیا ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ۝٩٥﴾ ’’اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اس کے پاس اکیلے اکیلے۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ۝١٦﴾ ’’جو کلیجوں کو کھینچ لے گی۔‘‘

شدّت کے اعتبار سے جہنّم کی آگ کا دنیا کی آگ سے کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ الھمزہ میں جہنّم کی آگ کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝٧﴾ کہ وہ براہِ راست دلوں میں جلن پیدا کرے گی۔ آج کل اس کیفیت کو ultra violet rays کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کی حرارت کھال کے اندر پہنچ کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔

آیت ۱۷ ﴿تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۝١٧﴾ ’’وہ پکارے گی ہر اُس شخص کو جس نے پیٹھ موڑ لی تھی اور رُخ پھیر لیا تھا۔‘‘

جہنّم کی آگ ہر اُس شخص کو پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر شکار کرے گی جس نے حق سے اعراض کیا تھا اور اللہ کے کلام کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ دین کی دعوت اور نبی

کریم ﷺ کے مشن کو کبھی لائقِ اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

آیت ۱۸ ﴿وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ﴿۱۸﴾﴾ ''اور جو مال جمع کرتا رہا پھر اسے سینت سینت کر رکھتا رہا۔''

جس نے اپنی ساری زندگی مال جمع کرنے اور اسے سنبھال کر رکھنے میں بتا دی تھی۔

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾﴾ ''یقیناً انسان پیدا کیا گیا ہے تھڑدلا۔''

یہ انسان کی فطری اور جبلی کمزوری ہے کہ وہ تُھڑدلا' کم حوصلہ اور بے صبرا ہے۔ قرآن مجید میں انسان کی کئی اور کمزوریوں کا ذکر بھی آیا ہے' مثلاً: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾﴾ (النساء) کہ انسان فطری طور پر کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ میں انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا قرار دیا گیا ہے' جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۷ میں انسان کی طبعی عجلت پسندی کا ذکر آیا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾۔ ظاہر ہے ایک انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔ انسان کے جسم کا تعلق عالمِ خلق سے ہے' جبکہ انسانی روح کا تعلق عالمِ امر سے ہے: ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ (بنی اسراءیل:۸۵) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ چنانچہ مذکورہ سب کمزوریوں کا تعلق انسان کی جسمانی خِلقت سے ہے۔ جہاں تک انسانی وجود کے اصل حصے یعنی اس کی روح کا تعلق ہے' بنیادی طور پر اس کا مقام بہت بلند ہے اور اس میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ انسان کی تخلیق کے اس پہلو کا ذکر سورۃ التین کی اس آیت میں آیا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾﴾ ''بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا''۔ لیکن افسوس کہ ہم انسانوں کی اکثریت اپنی روح سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اللہ کی یاد سے غفلت ہے۔ جو انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر اسے خود اپنی ذات (روح) سے غافل کر دیتا ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہلِ ایمان کو اس حوالے سے یوں متنبہ کیا گیا ہے: ﴿وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو دیکھنا!) تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

اگلی دو آیات هَلُوْعًا کی وضاحت پر مشتمل ہیں:

آیت ۲۰ ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾﴾ ''جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا

جانے والا ہے۔‘‘

جب کوئی انسان اپنی روح سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ نرا حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حیوان نما انسان کو جب کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ صبر کرنے کی بجائے فوراً چیخنا چلّانا شروع کر دیتا ہے اور جزع فزع کرنے لگتا ہے۔

آیت ۲۱ ﴿وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا ۝۲۱﴾ ’’اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے۔‘‘

جب اسے کشادگی حاصل ہوتی ہے تو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب اگلی آیات میں ان انسانی کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔ اپنے مضمون کے اعتبار سے ان آیات (آیت ۲۲ تا ۳۵) کا سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ قرآن مجید کے یہ دو مقامات نہ صرف باہم مشابہ ہیں بلکہ ’’اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضَهٗ بَعْضًا‘‘ کے اصول کے مطابق ایک مقام کی بعض آیات دوسرے مقام کی بعض آیات کی وضاحت بھی کرتی ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ’’مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘‘ کے تیسرے حصّے کا پہلا سبق ان ہی دو مقامات کی آیات (سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور زیر مطالعہ سورۃ کی آیت ۲۲ سے آیت ۳۵ تک چودہ آیات) پر مشتمل ہے۔ ان آیات میں دراصل بندۂ مؤمن کی سیرت وکردار کے ان اوصاف کی فہرست دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں۔ گویا یہ اوصاف وہ اینٹیں ہیں جنہیں کام میں لا کر ایک بندۂ مؤمن کو اپنی سیرت کی عمارت تعمیر کرنا ہے۔ اگر یہ اینٹیں کچی ہوں گی تو ان سے بنائی گئی عمارت کمزور اور بودی ہونے کے باعث کفر والحاد کے سیلاب کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ سیلِ باطل کی بلاخیزیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان ’’اینٹوں‘‘ کو خوب پختہ کر کے اپنی سیرت کی عمارت استوار کریں۔ بقول اکبرالٰہ آبادی: ؎

تُو آگ میں جل اور خاک میں مل‘ جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ‘ تعمیر نہ کر!

بہرحال گزشتہ آیات میں جن انسانی کمزوریوں کا ذکر ہے‘ عمومی طور پر انسان ان میں

مبتلا ہو کر ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ پیدائشی کمزوریاں ناقابلِ تغیّر و تبدّل نہیں‘ بلکہ انسان ان سے نجات پا سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل لوگ ان سے مستثنیٰ ہیں:

آیت ۲۲ ﴿اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ’’سوائے نمازیوں کے۔‘‘

ان کمزوریوں اور خامیوں سے محفوظ رکھنے والی ایک چیز نماز ہے۔ گویا نماز تعمیرِ سیرت کی بنیاد کا پہلا پتھر ہے‘ لیکن صرف وہ نماز جو خاص اہتمام سے مداومت کے ساتھ ادا کی جاتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ استثناء کے اہل صرف وہی نمازی ہوں گے:

آیت ۲۳ ﴿الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾﴾ ’’جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں۔‘‘

یعنی وہ لوگ جو اپنے روزمرہ معمولات میں نماز کو اوّلین ترجیح دیتے ہیں اور کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسے ’’نمازی‘‘ اس وصف کے مصداق نہیں بن سکتے جو ’’فارغ وقت‘‘ میں تو نماز ادا کر لیتے ہیں لیکن جب کوئی اور مصروفیت ہو تو انہیں نماز کا خیال تک نہیں آتا‘ اور نہ ہی انہیں نماز کے ضائع ہو جانے کا دکھ ہوتا ہے۔ اس آیت کے مشابہ سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے: ﴿الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾﴾ ’’وہ جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔‘‘

آیت ۲۴، ۲۵ ﴿وَ الَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۲۵﴾﴾ ’’اور وہ جن کے اموال میں معیّن حق ہے‘ مانگنے والے کا اور محروم کا۔‘‘

ایسے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یا جو کچھ بھی انہیں مل گیا ہے وہ سب اُن کا ہے‘ بلکہ وہ اپنے اموال میں سے ایک معیّن حصّہ معاشرے کے اُن محروم اور نادار افراد کے لیے مختص کیے رکھتے ہیں جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ دراصل اللہ تعالیٰ آزمائش کے لیے بعض لوگوں کے حصّے کا کچھ رزق بعض دوسرے لوگوں کے رزق میں شامل کر دیتا ہے۔ چنانچہ متمول افراد کو چاہیے کہ وہ اپنے اموال میں سے مساکین و فقراء کا حصّہ الگ کر کے ’’حق بہ حق دار رسید‘‘ کے اصول کے تحت خود ان تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ یاد رہے سورۃ المؤمنون میں اس آیت کے مقابل یہ آیت ہے: ﴿وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ﴿۴﴾﴾ ’’اور وہ جو ہر دم اپنے تزکیے کی طرف متوجّہ رہنے والے ہیں‘‘۔ ان دونوں آیات پر

غور کرنے سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ (غرباء ومساکین کا حق) ادا کر دینے سے نہ صرف بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ یہ انفاق انسان کے تزکیۂ باطن کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت سورۃ الحدید کی آیت ۱۷ اور ۱۸ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔ دراصل مال کی محبت جب کسی دل میں گھر کر جاتی ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ اس دل میں گندگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں دل کی صفائی یعنی تزکیۂ باطن کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے مال کی محبت کو دل سے نکالا جائے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے مال کو تو سینت سینت کر رکھتا ہے اور محض مراقبوں کے بل پر اپنے باطن اور نفس کا ''تزکیہ'' چاہتا ہے تو وہ گویا سراب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو ہلکان کر رہا ہے۔

آیت ۲۶ ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝۲۶﴾ ''اور جو فیصلے کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔''

زیر مطالعہ آیات کی سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسبت کے حوالے سے اس آیت کا تعلق سورۃ المومنون کی اس آیت سے ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں''۔ گویا زیر مطالعہ آیت سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیت کی وضاحت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے لغویات سے اعراض کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ قیامت اور جزا وسزا کے دن پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے اُس کے لیے تو اِس زندگی کا ایک ایک لمحہ اَمر (کبھی نہ مرنے والا' دائمی) ہے۔ بظاہر تو انسان کی یہ زندگی فانی (finite) ہے' لیکن درحقیقت بِالقُوّہ (potentially) یہ دائمی (infinite) ہے۔ اس لیے کہ اس فانی زندگی کے اعمال کا نتیجہ آخرت کی دوامی زندگی میں نکلے گا۔ دنیا میں انسان اچھے بُرے جو اعمال بھی کمائے گا' ان اعمال کے اثرات ونتائج آخرت کی زندگی میں ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوں گے۔ چنانچہ آخرت کی دوامی زندگی کے لیے جو پونجی انسان کو درکار ہے وہ تو دنیوی زندگی کے ''اوقات'' میں ہی کمائی جا سکتی ہے۔ سورۃ العصر کی پہلی آیت میں تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کی قسم کے پردے میں بھی دراصل یہی فلسفہ بیان ہوا ہے۔ گویا انسان کا اصل سرمایہ اُس کی مہلتِ عمر یعنی زندگی کے وہ قیمتی لمحات ہیں جو تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

آیت ۲۷ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ’’اور جو اپنے ربّ کے عذاب سے لرزاں وترساں رہتے ہیں۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمۡ غَیۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ﴿۲۸﴾﴾ ’’یقیناً ان کے ربّ کا عذاب ایسا نہیں ہے کہ کوئی اس سے نڈر ہو جائے۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَّالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۲۹﴾﴾ ’’اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔‘‘

آیت ۳۰ ﴿اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ ’’سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں کے‘ تو ان لوگوں پر کوئی ملامت نہیں۔‘‘

آیت ۳۱ ﴿فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ’’تو جو کوئی بھی اس کے علاوہ کچھ چاہے گا تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾ ’’اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں۔‘‘

یہ چاروں آیات سورۃ المؤمنون میں بھی (آیت ۵‘ ۶‘ ۷ اور ۸ کے طور پر) جوں کی توں آئی ہیں۔ البتہ اگلی آیت میں اہلِ ایمان کی سیرت کی ایک اضافی صفت کا ذکر ہے جو سورۃ المؤمنون کی مذکورہ آیات میں بیان نہیں ہوئی:

آیت ۳۳ ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ بِشَهٰدٰتِهِمۡ قَآئِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں۔‘‘

دراصل گواہی بھی ایک امانت ہے اور جو شخص غلط گواہی دیتا ہے یا گواہی کو چھپا لیتا ہے وہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ’’اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اُس نے چھپا لیا؟‘‘ علمائے یہود کے پاس نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے بارے میں اللہ کی طرف سے گواہی تھی‘

انہوں نے اس گواہی کو چھپا کر اللہ کی امانت میں خیانت کی۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اسی گواہی کو چھپانے کا ذکر ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’اور وہ لوگ کہ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔‘‘

آیت ۳۵ ﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو جنّتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزاز و اکرام ہوگا۔‘‘

آیات ۳۶ تا ۴۴

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

آیت ۳۶ ﴿فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ ’’دائیں اور بائیں سے غول در غول۔‘‘

دراصل مشرکین کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جس کسی نے بھی حضور ﷺ سے قرآن سن لیا وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس لیے حضور ﷺ جب لوگوں کو قرآن سنانے کے لیے کہیں کھڑے ہوتے تو وہ ہر طرف سے دوڑیں لگا کر آپؐ کے پاس پہنچ جاتے۔ ایسا دراصل وہ لوگوں کو حضور ﷺ کے گرد جمع ہونے سے روکنے کے لیے کرتے تھے‘ تاکہ وہ آپ ﷺ کی

زبانِ مبارک سے قرآن نہ سن سکیں۔

آیت ۳۸ ﴿اَیَطۡمَعُ کُلُّ امۡرِیًٔ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّدۡخَلَ جَنَّۃَ نَعِیۡمٍ ﴿۳۸﴾﴾ ’’کیا ان میں سے ہر ایک واقعتاً اس کا خواہش مند ہے کہ وہ نعمت بھری جنت میں داخل کیا جائے گا؟‘‘

آیت ۳۹ ﴿کَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقۡنٰہُمۡ مِّمَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ ’’ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اُس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں۔‘‘

یعنی ہر انسان جانتا ہے کہ اس کی تخلیق گندے پانی کی ایک بوند سے ہوئی ہے۔

آیت ۴۰ ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِرَبِّ الۡمَشٰرِقِ وَ الۡمَغٰرِبِ﴾ ’’تو نہیں! قسم ہے مجھے مشرقوں اور مغربوں کے ربّ کی‘‘

قرآن مجید میں صیغہ واحد کے طور پر تو مشرق اور مغرب کا ذکر بہت مرتبہ آیا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ میں رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَ رَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ بھی ہے' جبکہ آیت زیر مطالعہ میں دونوں سمتوں کے لیے جمع کے صیغے آئے ہیں۔ مشرق ومغرب سے متعلق ان تینوں صیغوں (واحد' تثنیہ اور جمع) کی وضاحت سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۷ کے تحت کی جا چکی ہے۔

﴿اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ﴿۴۰﴾﴾ ’’یقیناً ہم قادر ہیں۔‘‘

آیت ۴۱ ﴿عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ ۙ﴾ ’’اس پر کہ ہم ان کو ہٹا کر ان سے بہتر لوگ لے آئیں‘‘

یعنی ہم انہیں ختم کر کے ان کی جگہ کسی اور قوم کے افراد کو لے آئیں گے' جو ان سے بہتر ہوں گے۔ جیسے قومِ نوح کو ختم کر کے قومِ عاد کو پیدا کیا گیا اور پھر قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود کو عروج بخشا گیا۔ اس فقرے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آخرت میں ہم انہیں جو جسم دیں گے وہ ان کے موجودہ جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس بارے میں سورۃ الواقعۃ' آیت ۶۱ اور سورۃ الدھر' آیت ۲۸ میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ آخرت میں انسانوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہوں گے' لیکن زیر مطالعہ آیت کے مذکورہ مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کو آخرت میں دیے جانے والے جسم ان کے دنیا والے جسموں سے بہتر ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ جسم ان کے دنیا والے جسموں جیسے ہی ہوں گے' لیکن برداشت وغیرہ کے حوالے سے ان سے کہیں بڑھ کر ہوں گے۔ مثلاً جہنّم کی آگ جو دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ گرم اور شدید ہوگی

جب انسانوں کو جلائے گی تو وہ جل کر راکھ نہیں بن جائیں گے‘ بلکہ اس کی تپش کو برداشت کریں گے۔ اہلِ جہنّم کے جسموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوگی کہ ان کی کھالیں جل جانے کے بعد پھر سے اپنی اصل حالت پر آجائیں گی۔ بہرحال آخرت میں ان لوگوں کو جو جسم دیے جائیں گے وہ خصوصی طور پر آخرت کی سختیاں جھیلنے کے لیے بنائے جائیں گے۔ وہ سختیاں جو دنیا کی سختیوں سے کہیں بڑھ کر ہوں گی۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک)

﴿وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ ’’اور (اس معاملے میں) ہم ہارے ہوئے نہیں ہیں۔‘‘

ہم ان کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں‘ وہ ہماری گرفت سے نکل نہیں سکیں گے۔

آیت ۴۲ ﴿فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ چھوڑ دیجیے انہیں‘ یہ لگے رہیں بے ہودہ باتوں اور کھیل کود میں‘‘

﴿حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’یہاں تک کہ یہ ملاقات کریں اپنے اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔‘‘

قبل ازیں سورۃ الطور‘ آیت ۴۵ میں بھی ہم یہی الفاظ ﴿فَذَرۡهُمۡ حَتّٰی یُلٰقُوۡا﴾ پڑھ آئے ہیں۔ یہ اسلوب ابتدائی دور کی سورتوں میں عام ملتا ہے۔ اس میں ایک طرف حضور ﷺ کی دلجوئی اور تسلی کا پہلو ہے تو دوسری طرف مشرکین سے نفرت اور غصے کا اظہار بھی ہے۔

آیت ۴۳ ﴿یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا کَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ’’جس دن وہ نکلیں گے اپنی قبروں سے دوڑتے ہوئے‘ جیسے کہ وہ مقرر نشانوں کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔‘‘

’’نُصُب‘‘ سے مراد وہ نشان ہیں جو دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں تاکہ ہر دوڑنے والا دوسرے سے پہلے مقرر نشان پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

آیت ۴۴ ﴿خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ﴾ ’’ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی‘ ذِلّت ان پر چھائی ہوئی ہوگی۔‘‘

﴿ذٰلِكَ الۡیَوۡمُ الَّذِیۡ کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾ ’’یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔‘‘

❀❀❀

دین کے تقاضے: عملی لائحۂ عمل

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اپریل ۲۰۰۷ء میں قرآن اکیڈمی ڈیفنس کراچی میں ایک جامع خطاب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ (آل عمران:۱۹)

﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ (آل عمران:۸۵)

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ② فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ③﴾ (النصر)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

معزز حاضرین اور محترم خواتین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آج آپ کے سامنے ایک بڑی بنیادی بات رکھنا چاہتا ہوں۔ اُسی کے ذریعے سے ہمیں یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت اُمّتِ مُسلمہ کس مقام پر کھڑی ہے! اسلامی ممالک میں جو دینی اور مذہبی کام ہو رہے ہیں‘ اُن کی کیا نوعیتیں ہیں۔ اِس پس منظر میں جو کام ہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں‘ اُس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں اور یہ بقیہ کاموں سے کیسے مختلف ہیں!

دین اور مذہب میں فرق

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے اسلام ''دین'' ہے۔ مذہب کا لفظ پورے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ میرے علم کی حد تک احادیثِ نبویہ ﷺ میں بھی یہ لفظ نہیں آیا۔ ہمارے ہاں یہ لفظ مسلکوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے مذہبِ حنفی' مذہبِ مالکی' مذہبِ شافعی' مذہبِ سلفی۔ اسلام کے لیے لفظ ''دین'' ہے' ''مذہب'' نہیں۔ ان میں فرق کیا ہے؟

آج کی دُنیا میں یہ بات بہت نمایاں ہو کر سامنے آچکی ہے اور تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی کے دو حصے ہیں:

(۱) اجتماعی زندگی جس کا تعلق سیاست' معاشرت' معاشیات اور ملکی قوانین کے ساتھ ہے۔

(۲) انفرادی زندگی جو مذہب سے متعلق ہے۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ جو چاہے' مانے۔ جس عقیدے پر چاہے' believe کرے۔ ایک خدا کو' سو کو' دس کو مانے' یا پھر کسی کو نہ مانے۔ جس کو چاہے پوجے۔ پتھروں کو پوجے' بتوں کو پوجے' درختوں کو پوجے' جو چاہے پوجے۔ پھر کچھ سماجی رسم و رواج ہیں۔ بچہ پیدا ہوگا تو کیا کریں گے؟ کیسے تقریب منائیں گے؟ وہ عقیقہ ہوگا یا بپتسمہ (Baptism) ہوگا' وغیرہ وغیرہ۔ کوئی مرے گا تو میت کو dispose off کیسے کریں گے؟ تدفین کریں گے' جلائیں گے' یا پارسیوں کی طرح کسی اُونچے مقام پر رکھ دیں گے کہ چیلیں اور کوے کھا جائیں' وغیرہ وغیرہ۔ شادی ہوگی تو کیسے ہوگی؟ عیدیں کیسے منائی جائیں گی؟ تہوار کون کون سے ہوں گے؟ ان تمام معاملات کا تعلق مذہب سے ہے۔

آج پوری دُنیا کے اندر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مذہب میں ہر شخص کو مکمل آزادی ہے' البتہ اجتماعیت یعنی سیاسی نظام' معاشی نظام' معاشرتی نظام میں سے کسی کا تعلق مذہب سے نہیں ہوگا۔ ان کے حوالے سے ہر ملک کے رہنے والے لوگ خود قانون سازی کر سکتے ہیں۔ یہ عوامی حاکمیت (People`s Sovereignty) کا تصوّر ہے کہ عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے جو قانون چاہیں' بنالیں۔ اسی کا نام سیکولرازم (Secularism) ہے۔

آج دُنیا میں سارا جھگڑا اسی کا چل رہا ہے۔ خاص طور پر عالَمِ اسلام کے خلاف مغرب کی یلغار اسی ایشو پر ہے۔ امریکہ کا سابق صدر بش اگر یہ کہتا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف نہیں تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اسلام بطور مذہب اُن کے لیے قابلِ قبول ہے۔ بش کہتا ہے: تم امریکہ آئے۔ تم نے چرچ خریدے' اُن کو مسجدوں میں تبدیل کیا۔ تم نے سنیگاگ (یہودی عبادت گاہ) خریدے' اُن کو مسجدوں میں تبدیل کیا۔ ہم نے کبھی کوئی اعتراض کیا؟ تم نے لاکھوں افریقی نژاد امریکیوں (Afro-Americans) کو مسلمان بنالیا' ہم نے کوئی اعتراض کیا؟ تم روزے رکھتے ہو' ہم وائٹ ہاؤس کے اندر ایک افطار پارٹی کا انعقاد کر دیتے ہیں۔ تم عیدین مناتے ہو' ہم یادگاری ٹکٹ جاری کر دیتے ہیں۔ تمہارے مذہب سے ہماری کوئی جنگ نہیں ہے۔ البتہ اسلام کا سیاسی' معاشی' معاشرتی نظام اور اس کے عائلی قوانین ہمیں کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہیں۔ انہیں ہم نے ہر صورت ختم کر کے رہنا ہے۔

آج دنیا یک قطبی (unipolar) ہو چکی ہے۔ اب واحد سپر پاور کو کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس سے پہلے دو طاقتوں کی عمل داری (bipolar) تھی تو ہر سپر پاور کو یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر ہم کچھ کہیں گے تو اس کے ردِّعمل میں چھوٹے ملک مخالف کیمپ میں نہ چلے جائیں۔ لہٰذا وہ سنبھل کر اور ڈھکا چھپا کر بات کرتے تھے۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب امریکہ کے مقابلے میں کون ہے؟ اس لیے وہ کھل کر بات کرتے ہیں۔ رینڈ کارپوریشن کی ۸۰ صفحات کی رپورٹ میں کھل کر بات کی گئی کہ مسلمان چار قسم کے ہیں:

(۱) بنیاد پرست (fundamentalists) جو اسلام کو ایک نظام سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے دُشمن ہیں۔ ہم نے اُنہیں ختم کرنا ہے۔

(۲) روایت پسند (traditionalists) جو صرف روایتی اور مذہبی انداز کے اندر کام کرتے ہیں۔ اُن سے ہماری جنگ نہیں ہے اور وہ ہمارے لیے خطرناک بھی نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے نظام کا تصوّر نہیں ہے۔ البتہ کہیں اگر یہ بنیاد پرستوں کے نزدیک آجائیں تو پھر بہت خطرناک ہیں' اس لیے کہ ان کے پاس عوام تک رسائی کا

ذریعہ ہے۔ ان کے ہاں ہر جمعہ کو ایک جلسہ (اجتماعِ جمعہ) ہو رہا ہوتا ہے۔

(۳) جدّت پسند (modernists) جن کو آج کل ہمارے ہاں خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا کے اُوپر بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ یہ اسلام کی ایسی تعبیر کر رہے ہیں جو مغربی تہذیب کے اندر فٹ ہو جائے۔ ان کے نزدیک اسلام میں پردہ وردہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک خاص وقت کی معاشرت اور ثقافت تھی۔ اسی طرح شراب حرام نہیں ہے بلکہ شراب پی کر نشے میں دھت ہو جانا حرام ہے۔ موسیقی میں کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ رقص میں کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کی قبولیت کے لیے جواز دیا جا رہا ہے۔ اِن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اِنہیں سپورٹ کرو اور خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا پر exposure دلاؤ تاکہ ان کی بات لوگوں تک پہنچے۔ مسجدوں میں تو کوئی انہیں گھسنے نہیں دے گا۔

(۴) سیکولر (secular) لوگ تو بالکل ہماری طرح ہیں بلکہ ہمارے ہی ہیں۔

ماڈرنسٹ اور سیکولر کو چھوڑ دو جبکہ بقیہ دو کو ذرا علیحدہ رکھو' وہ قریب نہ آنے پائیں۔ روایت پسندوں کو آپس کے مذہبی اختلافات میں الجھاؤ۔ شیعہ اور سُنّی اختلاف' وہابی اور حنفی اختلاف' دیوبندی اور بریلوی اختلاف' اُس کو خوب اُجاگر کرو۔

اس وقت پوری دُنیا میں اصل مسئلہ یہ ہے۔

دین کا تقاضا

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں ہے۔ یہ مذہب بھی ہے اور دین بھی ہے۔ اس میں عقائد وایمانیات بھی ہیں' عبادات ورسومات بھی ہیں۔ ساتھ ہی اس کا ایک سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام بھی ہے۔ اس کے عائلی قوانین بھی ہیں۔ اس کا قانونِ وراثت ہے۔ اس کا نظام قانون شہادت ہے۔ یہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ اس حوالے سے میں نے دو آیتیں تلاوت کی ہیں:

﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟﴾ (آلِ عمران:۱۹)

''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔''

اور اُسی سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ﴾ (آیت ۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو قبول کرے (دیگر کسی نظامِ زندگی کو ذہناً قبول کر کے زندگی بسر کرے گا' جیسے ہمارے ملک میں بھی سیکولرازم ہے) تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

تیسری آیت جس کا میں نے حوالہ دیا ہے' اس میں ایک خاص بات ہے۔ یہ سورۃ الشوریٰ کی ہے:

﴿شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اے مسلمانو! تمہارے لیے ہم نے وہی دین (سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام) معیّن کیا ہے' جس کی وصیت کی تھی نوحؑ کو اور جس کی وحی ہم نے کی ہے (اے محمدﷺ) آپ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو' کہ قائم کرو دین کو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

وہ دین اب تکمیلی شکل میں تمارے سامنے آ گیا ہے۔

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (المائدہ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور تم پر اِتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔''

یہ نبوت و رسالت کا ہزاروں برس کا ایک پراسس تھا جو تدریجاً ارتقا کرتا ہوا بالآخر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مبارکہ پر اپنے climax کو پہنچ گیا' اور دین کامل ہو گیا!

اب تمہارے ذمے ہے کہ اِس دین کو قائم کرو' اِس نظام کو قائم کرو۔ اِسی کو کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کی حکومت قائم کرو' اللہ کا نظام قائم کرو۔ صرف نماز' روزہ' حج اور عمرہ نہیں۔ آج کل مسواک کی سُنّت پر زور ہے' لباس کی سُنّتیں ہیں' ٹخنے کھلے ہونے چاہئیں' وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی مذہب کے elements ہیں‘ ان کی بھی پیروی کرنی چاہیے۔ مذہب کے اعتبار سے ہمیں اپنا سینہ کشادہ رکھنا ہے۔ ہماری چاروں فقہیں حق ہیں۔ ’’دین‘‘ میں تفرقہ نہیں ہوگا‘ مذہب میں اختلاف ہوسکتا ہے۔

تفرقہ یہ ہے کہ ہمارا مسلک کچھ اور ہے جبکہ دوسروں کا کچھ اور۔ لہٰذا ہم کچھ اور ہیں‘ یہ کچھ اور ہیں۔ یعنی ’’تفریق بین الناس‘‘۔ لہٰذا ’’دین‘‘ کو قائم کرو! یہ مضمون قرآن مجید میں تین دفعہ آیا ہے۔ اپنے دروس میں مَیں نے بہت زور دیا ہے کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت ہی یہ تھا کہ دین کو غالب کریں۔ قرآن میں سورۃ التوبہ‘ سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں بعینہٖ یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا ہے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم‘ ہدایتِ کاملہ) اور دین کامل دے کرتا کہ غالب کریں اُسے پورے کے پورے نظامِ زندگی (سیاسی‘ معاشی‘ اور معاشرتی نظام) پر۔‘‘

سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں اس کے بعد الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ⑨﴾ ’’اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!‘‘

یہ مقصدِ بعثت کسی اور نبی کے لیے قرآن میں نہیں آیا۔ ہر نبی بشیر ہے‘ نذیر ہے‘ داعی ہے‘ مبلّغ ہے‘ معلّم ہے‘ مذکّر ہے! یہ ساری صورتیں تو مشترک ہیں‘ البتہ یہ الفاظ سوائے حضور ﷺ کے کسی نبی کے لیے نہیں آئے۔

اور یہ جو کام حضور ﷺ نے کیا ہے وہ مسلسل تیئیس برس کی جاں گسل محنت اور مشقت تھی۔ اسی لیے اس کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②﴾ (النصر)

’’اور جب اللہ کی نصرت اور فتح آ گئی۔ اور تم نے دیکھا کہ اب لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔‘‘

اللہ کی اطاعت میں آ رہے ہیں۔ اُس نظام کو قبول کر رہے ہیں جو ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ

وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ﴾ (الفتح:۲۹) نے قائم کیا۔ اُس کے اندر حضور ﷺ کو کیسی کیسی مشکلات پیش آئیں‘ کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ سینکڑوں صحابہ ؓ کو جان دے کر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ حضور ﷺ زخمی ہوئے۔ دو مرتبہ آپؐ کا خون مٹی میں جذب ہوا ہے۔ فاقے آئے ہیں۔ شعب ابی طالب کے اندر تین سال کی نظر بندی ہوئی ہے۔ یہ سارا دور ایک بہت بڑی انقلابی جِدّوجُہد (revolutionary struggle) پر محیط ہے‘ جس کے نتیجے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

﴿وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَہَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا ﴿۸۱﴾﴾ (الاسراء)

’’اور آپؐ کہہ دیجیے کہ حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی بھاگ جانے والا۔‘‘

اب پورا نظام زندگی اللہ کی اطاعت کے تابع ہو گا۔ سیاست بھی اُسی کے مطابق ہوگی‘ معیشت بھی اُسی کے مطابق ہوگی۔ سود حرام ہے‘ جوا حرام ہے‘ منشیات حرام ہیں‘ جنسیات کے حوالے سے کمائی حرام ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ عصمت وعفت کی حفاظت‘ شرم وحیا اور خاندانی نظام کی مضبوطی۔ یہ سب ہو گیا تو دین قائم ہو گیا۔ پھر مذہب بھی اس کے تابع ہو گیا۔ یہ ہے بہت بڑی تاریخی کامیابی (historical achievement)‘ جس کے بارے میں بڑے بڑے سکالرز نے کہا ہے کہ: ’’تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔‘‘

ایم این رائے جو لینن کا دوست اور بہت بڑا کمیونسٹ تھا‘ اُس نے ۱۹۲۰ء میں لاہور میں تقریر کی تھی۔ اُس کی کتاب ’’Historical Role of Islam‘‘ اب بھی بھارت میں چھپتی ہے۔ اس نے تحریر کیا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔ ۱۹۸۰ء میں مائیکل ہارٹ کی کتاب ’’The Hundred‘‘ چھپی ہے۔ کسی معاشرے میں زیادہ تر لوگ تو دھارے میں بہتے ہیں۔ جو نظام ہے اُسی میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جدھر ہجوم جا رہا ہے اُدھر جا رہے ہیں۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اب تک کی تاریخِ انسانی سے

ایسے 100 آدمیوں کو منتخب (select) کیا' پھر ان کی درجہ بندی (gradation) کی۔ ان میں وہ نمبر ایک پر لایا ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو۔ حالانکہ مصنف خود عیسائی تھا' لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نمبر تین پر لے گیا۔ نمبر دو پر بابائے فزکس نیوٹن کو رکھا ہے۔ عہدِ حاضر کی ساری ٹیکنالوجی کا بابا نیوٹن ہے' جسے جدید طبعیات کا موجد کہا جاتا ہے۔

زوال کا آغاز

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دس گیارہ برس مدینہ منورہ میں یہ نظام قائم ہوا۔ اس کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا خلافتِ راشدہ کے تیس برس میں یہ نظام کامل ترین شکل میں قائم رہا۔ حکومت اللہ کی' قانون اللہ کا اور حکمران مشورے سے منتخب ہوگا۔ یہ موروثی بادشاہت نہیں ہے۔ ﴿وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ (الشوریٰ:۳۸) سے معاملات طے ہوں گے۔ آمرانہ (authoritarian) نظم نہیں ہوگا۔ یہ چالیس برس ہمارا وہ سنہری دور ہے جس کے اندر دین ایک رہا۔ اس کے بعد یہ حادثہ ہوا کہ ایک یہودی سازش کے نتیجے میں internal sabotage ہوا۔ عبداللہ بن سبا کی تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا گیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور اُن کی شہادت سے فتنے کا جو دروازہ کُھلا ہے تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا سارا دورِ خلافت خانہ جنگی کی نذر ہوگیا۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ایک انچ زمین بھی اسلامی سلطنت میں مزید شامل نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے کے تیروں' تلواروں اور نیزوں سے ایک لاکھ آدمی ہلاک ہوگئے۔ وہ جو ایک بہاؤ تھا کہ ع ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!'' اس کی رفتار ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ خلافتِ راشدہ ختم ہوگئی اور ملوکیت کا آغاز ہوگیا۔

اب ہوگیا موروثی معاملہ۔ جس کی طاقت ہوگی' اسی کی حکومت ہوگی۔ بنواُمیہ طاقت وَر قبیلہ تھا' اُن کی حکومت ہوگئی۔ پھر بنوعباس کھڑے ہوگئے۔ اُنہوں نے بنواُمیہ کو مارا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ سیاسی اعتبار سے اسلام کا نظام ختم ہوگیا۔ یہ ہمارے دورِ زوال کا نقطہ آغاز تھا۔ اس دور میں کافی کوششیں ہوئیں کہ دوبارہ اصل کی طرف رجوع کیا جائے۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما ' حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ' حضرت نفس زکیہؒ اور

حضرت زیدؒ نے کوششیں کیں کہ کسی طریقے سے موروثی نظام ختم ہو کر خلافت کا شورائی نظام قائم ہو جائے مگر کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اُمّت نے سوچا کہ یہ چھت تو اب ہٹ نہیں سکتی۔ اوپر کا سیاسی نظام تو یہی رہے گا۔ گویا جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اب اس کے حوالے سے کچھ علمی یا اصلاحی کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ صوفیاء نے یہ کام کیا۔ وہ تزکیۂ نفس کرتے رہے اور کچھ علمی کام بھی ہوا۔ مذہب بہرحال برقرار (intact) رہا۔ نہ بنواُمیہ نے کہا کہ نماز کا نظام ختم کر دو اور نہ بنوعباس نے کہا۔ صرف سیاسی نظام بدلا تھا۔ ملوکیت کے دوران بھی ایک ہزار برس تک اسلامی قانون نافذ رہا ہے۔ اب سلاطین ہیں' بادشاہ ہیں۔ بابر نے آ کر لودھی کو شکست دی ہے اور حاکم بن کر بیٹھ گیا ہے۔ وہی اصول کہ جس کی طاقت اُس کی حکومت۔ البتہ جب تک مسلمانوں کی حکومتیں رہیں' مذہب بہرحال رہا۔ قاضی اور مفتی ہوتے تھے۔ جمعہ کا اہتمام حکومت کرتی تھی اور خطیب صرف سرکاری ہوتے تھے۔ تین عہدے ہوتے تھے: قاضی' مفتی اور خطیب۔ کوئی پنج وقتہ نماز کے لیے مسجد بنانا چاہے تو بنا لے' لیکن جامع مسجد صرف حکومت کی ہو گی۔ سعودی عرب میں آج بھی یہی نظام ہے۔ ترکی میں بھی ایسا ہی ہے۔ پانچ وقت نمازوں کے لیے عام مسجد کوئی بھی بنا سکتا ہے' لیکن جامع مسجد حکومت کے تحت ہو گی۔

درجہ بدرجہ تنزّل

ملوکیت کا یہ نظام جب چلا تو اسلام کا تصوّر سکڑ گیا۔ اب وہ ''دین'' والی بات نہیں رہی بلکہ ''مذہب'' کا تصوّر غالب آ گیا۔ جب ہزار برس تک یہ کیفیت رہی تو ذہنوں نے گویا مصالحت (reconcile) کر لی کہ بس یہی ''اسلام'' ہے۔

اس کے بعد تیسرا مرحلہ آیا تو اس نے اور قیامت ڈھا دی۔ یورپی استعمار (Europian colonialism) آیا اور یورپ سے جو طاقت ور قوتیں اُٹھیں' انہوں نے پورا ایشیا فتح کیا۔ خاص طور پر عالمِ اسلام میں کہیں انگریز آ گئے' کہیں فرانسیسی آ گئے' کہیں اطالوی آ گئے' کہیں ہسپانوی آ گئے۔ اب وہاں اُن کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اسلامی

قانون گیا تو اب عدالتیں اُن کی۔فوجداری نظام اُن کا ہو گا' دیوانی قانون اُن کا ہوگا۔مسلمان نمازیں پڑھیں' روزے رکھیں' انہیں کوئی اعتراض نہیں۔اب مفتیوں کا رول بھی بہت محدود ہو گیا۔ان سے صرف نکاح وطلاق کے مسائل پوچھے جا سکتے ہیں' یا یہ کہ وضو رہ گیا کہ نہیں' روزہ رہ گیا یا ٹوٹ گیا! باقی مسائل حکومت طے کر رہی ہے۔ ہمارے family laws انگریزوں نے برقرار رکھے تھے کہ طلاق وغیرہ کے معاملات اپنے مفتیوں کے حوالے سے جیسے چاہو طے کرلو' ہم اس کے اندر دخل اندازی نہیں کریں گے۔ انگریز نے یہ بھی رعایت دی تھی کہ تم اپنا قانونِ وراثت نافذ کرلو' لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ فیصلہ رواج کے مطابق ہو تو ہم کر دیں گے۔ہندوستان میں کم سے کم ۲۰۰ برس تک یہ حالات رہے۔اس دوران مسلمان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اسلام اب محض ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے۔اسلام کا تصوّرِ دین نکل گیا۔دین تو انگریز کا ہے۔حاکمیت اُس کی ہے۔ اللہ کے دین کا مطلب ہے''اللہ حاکم''۔اُس کا قانون نافذ ہو تو یہ اللہ کا دین ہے۔

سورۂ یوسف میں ''دِيْنِ الْمَلِكِ'' کا لفظ آیا ہے۔اس کا مطلب یہ کہ مصر کا بادشاہ جو حاکم ہے اُس کا قانون نافذ ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام بھی ایک بہت بڑے منتظم تھے مگر بادشاہ تو نہیں تھے۔اسی لیے قرآن مجید میں آتا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو وہ روکنا چاہتے تھے تو ہم نے اس کے لیے ایک شکل پیدا کر دی۔﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ﴾ (یوسف:۷۶) ''اس طرح سے ہم نے تدبیر کی یوسف کے لیے۔''﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (یوسف:۷۶) ''آپؑ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنے بھائی کو روکتے بادشاہ کے قانون کے مطابق۔'' وہ تو دین الملک تھا وہاں پر' دین یوسفؑ تو نہیں تھا' لہٰذا وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ عوام الناس کے علاوہ ہمارے کچھ مذہبی طبقات کے اندر بھی ''تصوّرِ دین'' ناپید ہو گیا ہے اور اسلام کا تصوّر صرف مذہب کی حیثیت سے رہ گیا ہے۔

اس کے بعد ایک دور آیا جب مسلمانوں نے استعمار کے خلاف بغاوتیں کیں۔ مہدی سوڈانیؒ نے سوڈان میں کی' ناکام ہو گئے! امام شاملؒ نے روس میں کی' ناکام ہو گئے!

عبدالقادر الجزائریؒ نے الجزائر میں کی‘ ناکام ہو گئے! سنوسیؒ نے لیبیا میں کی‘ ناکام ہو گئے! یہاں سیداحمد شہید بریلویؒ نے کی‘ ناکام ہو گئے!

اس سے پہلے ہمارے مجدّدین نے نظام کو بدلنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ عقائد میں کوئی خرابی آئی تو اُس کی اصلاح کر دی۔ لوگوں کے اعمال میں کوئی خرابی آ رہی تھی تو اس کی اصلاح کر دی۔ دین قائم کرنے کا مطلب ہے حکومت سے ٹکراؤ‘ جبکہ حکومت بھی مسلمانوں کی ہو۔ ایسی بہت سی حدیثیں موجود ہیں کہ مسلمان حاکم ہو اور اگر وہ کفر کا حکم نہ دے تو اس کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کسی نے تلوار نہیں اُٹھائی۔

شروع میں چند حضرات نے ملوکیت کے خلاف تلوار اٹھائی جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا۔ اس کے بعد کسی نے یہ ہمت نہیں کی۔ کسی نے ملوکیت کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اخلاقی سطح پر اصلاح ہوتی رہی۔ علمی کام امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ جیسے حضرات کرتے رہے۔ اگر تصوّف میں کچھ غلط چیزیں آ گئیں تو شیخ احمد سرہندیؒ جیسے حضرات نے اس کی اصلاح کی۔ الغرض یہ ساری کوششیں اصلاحی تھیں۔

بیداری کی لہر

جب نو آبادیاتی نظام ختم ہوا تو ہمیں یاد آیا کہ ہمارا بھی ایک نظام تھا۔ جیسے جیسے نو آبادیاتی نظام کا بستر لپٹا ہے تو ایک بیداری پیدا ہوئی کہ اسلام ایک نظام ہے اور ہمیں اپنے نظام کو قائم کرنا چاہیے۔ یہ صحیح سوچ اور جذبہ پورے عالمِ اسلام میں پیدا ہوا۔ چنانچہ کچھ لوگ سامنے آئے جنہوں نے اس تصوّر کو زندہ کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ دین وہ ہوتا ہی تب ہے جبکہ غالب ہو۔ جب مغلوب ہو تو مذہب ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں بھی مذہب موجود ہے اور بھارت میں بھی۔ دین کا سوال اگر آپ اُٹھائیں گے تو اُس کا مطلب ہے آپ وہاں رائج نظام کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ کوئی مذہب کی تبلیغ کرے‘ حکومت کو کوئی مسئلہ نہیں۔ مذہب کے معاملے میں آزادی ہے‘ دین کے معاملے میں نہیں۔

آج جو بھی یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک نظام ہے‘ اسے بنیاد پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر نے کھل کر کہا ہے کہ خلافت کا نام لینے والے

بنیاد پرست ہیں‘ اُن کے خلاف ہماری جنگ ہے‘ ہم اُن کو ختم کر کے رہیں گے۔ مَیں جس بات کی طرف آنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اِس خیال کو دوبارہ زندہ کرنے کا سہرا بدقسمتی سے علماء کرام کے سر نہیں ہے بلکہ کچھ غیر عالم مفکّرین‘ مصنّفین اور داعیین پیدا ہوئے جنہوں نے یہ بیڑا اٹھایا۔ ہمارے علماء نے بالعموم اسلام کو مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور ان کا سارا زور عبادات پر ہے‘ سُنّتوں پر ہے۔ نظام کی بات وہ نہیں کرتے! اللہ کی حکومت قائم کرنے کی بات نہیں کرتے۔

ہمارے جو مدارس چلے آ رہے ہیں اُن کی تاریخ بھی یہی ہے۔ دراصل مسلمانوں کی جب حکومت تھی تو قاضی‘ مفتی اور خطیب پیدا کرنے کے لیے یہ نظام بنا تھا۔ جیسے آج کل ہوتا ہے کہ حکومت کو مختلف کیڈر کے لیے سی ایس پی اور پی سی ایس آفیسرز چاہئیں تو ان کے لیے امتحانات لیتے ہیں‘ پھر ٹریننگز ہوتی ہیں۔ ان کے لیے تربیتی ادارے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی نظام تعلیم حقیقت میں مسلمان حکومتوں کے دور میں اُس وقت کی ضرورت تھی۔ قاضی‘ مفتی اور خطیب سرکاری تنخواہ (pay roll) پر ہوتے تھے۔ وہ اس نظام کو لے کر چل رہے تھے۔

اس نظامِ تعلیم میں یہ بات تو موجود ہے جو ہمارے مجدّدین کا کام تھا کہ کوئی فتنہ پیدا ہو تو اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ فتنہ انکارِ حدیث اُٹھا تو اُس کو ردّ کرنے کے لیے علماء کھڑے ہو گئے۔ فتنہ انکارِ ختم نبوت مرزا غلام قادیانی کی صورت میں سامنے آیا‘ اس کو ختم کرنے کے لیے علماء سامنے آ گئے۔ مذہب‘ عقائد اور عبادات کے تحفّظ کے لیے علماء کھڑے ہوتے ہیں اور محنت کرتے ہیں۔ آج ایک بہت بڑی تحریک‘ تبلیغی جماعت بھی اُسی مذہبی تصوّر کو ایک حرکی تصوّر اور جوش و جذبہ کے ساتھ لے کر چل رہی ہے۔ البتہ یہ تصوّر کہ اسلام دین ہے‘ اس کا سب سے پہلے سراغ ملے گا علّامہ اقبال کے ہاں۔ وہ مولوی نہ تھے‘ حالانکہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم و تربیت کے اندر مذہبی دخل حاصل تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ انگلینڈ گئے تو وہاں ان کی قلب ماہیت ہوئی ہے:ع مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے۔ جب انگلینڈ سے واپس آئے تو پھر وہ اسلام بحیثیت دین کے

علمبردار بن کر کھڑے ہو گئے کہ اسلام ہمارا دین ہے‘ صرف مذہب نہیں ہے ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

ہمارے بعض علماء نے انگریزی عہد میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ہمارے حکمرانوں کو تشویش ہو جائے‘ کیونکہ اُنہوں نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ اس پر علّامہ اقبال نے یہ شعر چُست کیا تھا ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کہاں آزاد ہے؟ کہاں ہے اسلام کا قانون؟ کہاں ہیں اسلامی حدود؟ کہاں ہیں اسلامی تعزیرات؟ کہاں ہے اسلام کا نظام؟ سود بدترین گناہ ہے‘ اس سے بڑا کوئی گناہ ہے ہی نہیں‘ لیکن اسی پر سارا نظام چل رہا ہے۔ مذہب تو ایک ہیولا ہے۔ اُس میں عقائد‘ عبادات اور رسومات ہیں۔ نماز پڑھو‘ روزے رکھو‘ عیدین مناؤ —— اگرچہ ہم نے ایک تیسری عید کا بھی اضافہ کر لیا ہے جس کا کوئی ثبوت صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحین سے نہیں —— بچوں کا عقیقہ کرو۔ شادی ہو گی تو ایجاب وقبول ہو گا۔ کوئی فوت ہو گا تو اس کو دفن کیا جائے گا‘ کفن دیا جائے گا۔ یہ سارے کام کرو‘ اس کی آزادی ہے۔

آج کی دُنیا بھی اس کی آزادی دیتی ہے۔ اسلام کے بدترین دُشمن بھی یہ آزادی دیتے ہیں‘ لیکن اسلام بحیثیت دین ہمارے عوام کے ننانوے فی صد کے ذہن سے نکل چکا ہے۔ RAND کارپوریشن کے حوالے سے ایک تو بنیاد پرست گروہ ہیں‘ جو اسلام کو نظام سمجھتے ہیں‘ جب کہ ایک روایت پسند ہیں‘ جو مدارس میں قال اللہ و قال رسول ﷺ کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے روایتی علماء ہیں اور اُن کا وہی مذہب کا تصوّر ہے۔ اس کے دفاع کے لیے وہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کے لیے بڑی بڑی تحریکیں بھی چل رہی ہیں اور یہ قربانیاں بھی دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کو بحیثیت دین دوبارہ قائم کرنے کی طرف اُن کی توجہ نہیں ہے۔ اسی لیے علّامہ اقبال نے یہ آواز اٹھائی کہ دنیا میں اسلام کا

دوبارہ غلبہ ہوگا۔ ملّتِ اسلامیہ کی تجدید ہوگی۔ ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا ' عدالت کا ' شجاعت کا !
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا!

دُنیا کی امامت مسلمان کا کام ہے۔ وہ اللہ کا ماننے والا ہے' اللہ کا نائب ہے۔ دُنیا کی امامت اُس کا حق ہے نہ کہ کُفّار' مشرکین اور ملحدین کا! اس جذبے نے پورے عالَمِ اسلام میں تحریکوں کی شکلیں اختیار کیں کہ اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے قائم کرنے کی جِدّو جُہد کی جائے۔ انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی بہت بڑی پارٹی تھی۔ ہندوستان میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسی بات کو لے کر کھڑے ہوئے۔ اُس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں ''حزبُ اللہ'' قائم کی تھی۔ مصر کے اندر ''الاخوان المسلمون'' کھڑے ہوئے۔

ناکامی کی وجوہات

ان تحریکوں نے کام کیا اور اُس کا اثر آج یہ ہے کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کی ایک بڑی اکثریت میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ البتہ ان تحریکوں سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے یہ کامیاب نہیں ہوسکیں۔ دو غلطیوں کی طرف مَیں اشارہ کرتا ہوں:

(۱) انہوں نے سمجھ لیا کہ جب ہم مسلمان ہیں تو ہمارے پاس ایمان تو ہے۔ یہ بات بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اسلام اور ہے' ایمان اور ہے۔ اسلام تو ہمیں موروثی طور پر مل گیا۔ ہم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے۔ پیدا ہوتے ہی داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہہ دی گئی۔ اسلام تو مل گیا' لیکن ایمان یوں نہیں ملتا۔ اب پوزیشن اصل میں یہ ہے کہ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (الحجرات:۱۴)

’’یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔‘‘

یہ کیفیت آج اُمّتِ مُسلمہ کی اکثریت کی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت مؤمن نہیں، مسلم ہے۔ اگر مسلمانوں کی اکثریت مؤمن ہوتی تو وہ دُنیا میں ذلیل وخوار نہیں ہو سکتے تھے۔

﴿وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝۱۳۹﴾ (آل عمران)

یعنی اے مسلمانو! گھبراؤ نہیں، اور نہ غم کھاؤ، ہمارا وعدہ ہے کہ اگر تم مومن ہو گے تو تم ہی سب سے سربلند ہو گے —— آج ہم تو سربلند نہیں ہیں بلکہ یہ مقام امریکہ، برطانیہ، یورپ، چین اور روس کو حاصل ہے۔ جی سیون، جی ایٹ، جی نائن، جی الیون، جی تیرہ، جی پندرہ میں وہ لوگ بیٹھتے ہیں اور دُنیا کے معاملات طے کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں کوئی مسلمان ہے ہی نہیں۔ ہم تین میں نہ تیرہ میں، ہماری حیثیت کیا ہے! آج اُمّتِ مُسلمہ کی جو پٹائی ہو رہی ہے، جو عذاب آ رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے آ رہا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر تو پتّا تک جنبش نہیں کھاتا۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم نے آج تک دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں کیا۔

جو آزاد ہوا، اُس نے واشنگٹن یا ماسکو کو اپنا قبلہ بنا لیا۔ اسلام کہیں نہیں آیا! ہم اللہ کے مجرم ہیں، یہ سزا اللہ کی طرف سے ہمیں مل رہی ہے! یہ سزا جاری رہے گی جب تک کہ ہم اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے قائم کر کے دُنیا کے سامنے نمونہ پیش نہ کر دیں۔ ہم دُنیا کو دعوت نہ دے سکیں کہ آؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھو، یہ ہے اسلام! تب ہم ’’شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ‘‘ کی حُجّت قائم کر سکیں گے کہ یہ دین ہے اللہ کا۔ یہ سچّا دین ہے جو انسان کو ایسا بہترین نظام دیتا ہے جس میں سب کے حقوق کا لحاظ ہے، توازن اور اعتدال ہے۔ جس میں کفالتِ عامہ کا نظام بھی ہے۔ خلافتِ راشدہ میں بچے کے پیدا ہوتے ہی اُس کا وظیفہ

مقرر ہو جاتا تھا۔ جو سوشل سکیورٹی آج سکینڈے نیوین ممالک میں نظر آ رہی ہے وہ زکوٰۃ کے نظام کے تحت مسلمانوں نے دی تھی۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد جِدّ و جُہد ہے۔

ہم نے فرض کر لیا کہ ہم مؤمن ہیں جبکہ یقین والا ایمان تو ہے ہی نہیں۔ محض ایک قانونی ایمان ہے جو زبانی اقرار پر مشتمل ہے۔ مسلمان ہونے اور دل میں یقین پیدا ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ہندوستان میں مَیں نے تین آمیوں کا نام لیا ہے۔ علّامہ اقبال مردِ میدان تھے ہی نہیں، صرف مفکّر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت بڑا فکر دیا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد میدان میں آئے اور ''حزبُ اللہ'' قائم کی۔ اس کا مقصد حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔ اندازہ کیجیے کہ انگریز کی حکومت کا دور ہے اور اُس میں وہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جماعت قائم کر رہے ہیں۔ انہیں یہ امید تھی کہ علماء کرام میرا ساتھ دیں گے' مگر ایسا نہیں ہوا۔ علماء کرام کا تصوّر وہ ہے ہی نہیں' اور یہ میں تجزیہ کر کے بتا چکا ہوں۔ سب سے پہلے پوچھا گیا کہ ان کے پاس کسی مدرسے کی کوئی سند ہے' یا ہمارے کسی مستند شیخ کے ہاتھوں ان کی تربیت ہوئی ہے! ایسا اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ ایک عظیم دینی شخصیت اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ' جنہیں مَیں ۱۴ویں صدی ہجری کا سب سے بڑا مجدد مانتا ہوں' وہ اُن کی پشت پر تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا' جس میں حضرت شیخ الہندؒ نے یہ تجویز پیش کی کہ ابوالکلام آزاد کو ''امام الہند'' مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ مگر علماء تیار نہیں ہوئے۔ ابوالکلام آزاد نے بددل ہو کر ''حزب اللہ'' کا بستر لپیٹا اور کانگریس میں جا کر ایک freedom fighter کی حیثیت سے زندگی گزارنا شروع کر دی۔ مجھے تو بس ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام آزاد سے دلچسپی ہے۔ بعد میں انہوں نے سیاست میں حصّہ لیا اور گاندھی کا چیلا بن بیٹھے۔ اس ضمن میں اُن کے بارے میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو بہرحال ناگفتہ بہ ہیں۔

اب وہ چیزیں چھوڑ دیجیے۔ مَیں اپنے آپ کو اُن سے وابستہ نہیں کرتا۔ میری وابستگی اُس ابوالکلام کے ساتھ ہے جس نے ''الہلال'' جاری کیا تھا۔

اس کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اُٹھے۔ ان میں محنت کا جذبہ بہت تھا۔ اُنہوں نے جماعت اسلامی قائم کی اور اُس کا جو پہلا دستور بنا اُس کا عنوان تھا: ''حکومتِ الٰہیہ کا قیام''۔ انگریز کے دور میں یہ بات کہنا گویا بغاوت تھی کہ ہم انگریز کی نہیں' اللہ کی حکومت چاہتے ہیں! تاہم دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں انگریز اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اُسے یہاں سے جانا ہی تھا۔ دوسرے اُنہوں نے سوچا کہ ابھی ان کے ساتھ دو اڑھائی سو آدمی ہیں' تو یہ کون سا تیر مار لیں گے! لہٰذا اُنہیں چھیڑا نہیں' وگرنہ یہ کلمہ بغاوت تھا۔ مولانا نے کھل کر کہا کہ نہ صرف انگریز کی فوج کی ملازمت حرام ہے بلکہ اس کی کسی بھی قسم کی ملازمت بھی حرام ہے۔ مولانا مودودیؒ کی یہ انقلابی بات شاید کسی نے کبھی سنی ہی نہ ہو! البتہ جماعت اسلامی کے لوگوں کو انہوں نے یہ اجازت دی تھی کہ پبلک یوٹیلیٹی اور پبلک سروس کے محکموں جیسے ریل یا ڈاک وغیرہ کی ملازمت ہو سکتی ہے۔ انگریز کا عدالتی نظام تو اللہ کی بجائے کسی اور قانون کے تحت فیصلے کر رہا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ...... ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ...... ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المائدۃ)

''جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں ...... وہی تو ظالم (مشرک) ہیں ...... وہی تو فاسق ہیں۔''

اور جو اللہ کے قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کی وکالت کر رہے ہیں' یہ کون ہیں؟

(۲) دوسری غلطی ان تحریکوں سے یہ ہوئی کہ انہوں نے دین کو قائم کرنے کے لیے وہی طریقے اختیار کر لیے جو اُس وقت دُنیا میں رائج تھے۔ الیکشن کا طریقہ اختیار کر لیا۔ یہ کام تو تاریخ انسانی میں ایک ہی مرتبہ ہوا تھا' اور وہ حضور ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اور ہونا ہے اور یہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایسا ہونا ہے۔ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا' دین حق قائم ہوگا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہوگا۔ یہ احادیثِ

صحیحہ کے اندر آیا ہے۔ ایک دفعہ ہونا ہے‘ لیکن ہوگا اُسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

’’(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔‘‘

فلسفۂ سیرت کی اہمیت

سیرت کو بین السطور پڑھیں اور سیرت کے فلسفے کو سمجھیں۔ سیرت میں بظاہر جو تضادات نظر آتے ہیں‘ اُن کو سمجھیں کہ یہ کیوں ہیں۔ مثال کے طور پر آرنلڈ ٹائن بی نے زہر میں بجھا ہوا ایک جملہ کہا کہ: Muhammad failed as prophet but succeeded as a statesman۔ اُس کے نزدیک مکّہ میں تو محمد (ﷺ) کا نقشہ نظر آتا ہے نبیوں والا‘ حضرت مسیحؑ کی طرح دعوت دے رہے ہیں‘ مگر وہاں وہ ناکام ہو گئے‘ انہیں وہاں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ البتہ مدینہ میں ایک سیاست دان کی حیثیت سے وہ کامیاب ہو گئے۔ اِسی کو بنیاد بنا کر منٹگمری واٹ نے دو کتابیں لکھ دیں۔ ہمارے ہاں جو مسلمان سمجھتے ہیں کہ اُس نے حضور ﷺ کی بہت تعریفیں کی ہیں‘ وہ اس کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ’’Muhammad at Mecca‘‘ اور ’’Muhammad at Mdina‘‘۔ ان دو کتابوں میں جس چیز کو highlight کیا گیا ہے‘ وہ یہ تضاد ہے۔ یعنی مکہ میں یہ کچھ اور شخصیت ہے‘ مدینہ میں کچھ اور شخصیت ہے۔ مکّہ میں یہ مبلّغ ہے‘ داعی ہے‘ درویش ہے‘ کوئی گالی دے رہا ہے تو دُعائیں دے رہا ہے‘ کوئی پتھراؤ کر رہا ہے تو اُس کے لیے بھی ہدایت کی دُعا کر رہا ہے۔ جب کہ مدینہ میں یہ دشمن کے مقابل لشکر صف آرا کر رہا ہے۔ اس حوالے سے سیرت کے فلسفے کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس موضوع پر اللہ کے فضل وکرم سے میری دو کتابیں ہیں۔ ایک چھوٹی اور ایک ذرا بڑی ہے۔ چھوٹی کتاب ’’رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب‘‘ سے ایک خاکہ سامنے آجائے گا۔ مَیں نے ’’رسولِ انقلاب‘‘ کہا ہے‘ اس لیے کہ صرف آپ ﷺ کے ذریعے سے انقلاب برپا ہوا تھا‘ اور کسی نبی کے ذریعے سے نہیں ہوا۔ ’’منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ‘‘ ایک بڑی ضخیم کتاب ہے‘ جس میں

پوری سیرت کا تجزیہ (analysis) ہے۔فلسفہ سیرت سے مَیں نے انقلاب کے چھ مراحل (six stages) اور پورا انقلابی عمل (revolutionary process) اخذ کیا ہے۔میرا دعویٰ یہ ہے کہ ایک انقلابی عمل کے لیے اگر کوئی source کہیں سے آپ کو مل سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔

اس کو چھوڑ کر الیکشن کے راستے پر آ جانا کیسے درست ہوسکتا ہے! ذرا سوچیں کیا حضور ﷺ الیکشن کے ذریعے عرب میں کامیاب ہو سکتے تھے؟ یا صرف وعظ ونصیحت کے راستے سے کامیاب ہو سکتے تھے؟ صرف وعظ ونصیحت کی آج ایک بہت بڑی تحریک ہے جو اسے نبوی طریق کہتی ہے۔اگر اس راستے سے کامیابی ہوسکتی تو محمد ﷺ کبھی ہاتھ میں تلوار لیتے؟ کسی مسلمان کے خون کا قطرہ تو کیا' کسی کافر کے خون کا قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے۔آپ ﷺ سے بڑا مبلغ' مربی اور مزکی کوئی ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔مگر دعوت وتبلیغ سے نظام نہیں بدلا۔؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

دعوت وتبلیغ سے کچھ سلیم الفطرت لوگ تو ساتھ آجائیں گے مگر جن کے مفادات غلط نظام کے ساتھ وابستہ ہیں وہ کب سنیں گے؟ آپ جاگیردارانہ نظام کے خلاف بات کر کے تو دیکھیں! اس لیے انتخابات اور محض دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔البتہ دعوت وتبلیغ سے بہت سے لوگوں کی انفرادی اصلاح ہوجائے گی۔وہ مذہب پر زیادہ کاربند ہوجائیں گے۔پہلے شیو کر رہے تھے' اب داڑھی رکھ لیں گے۔پہلے اُن کی شامیں تفریح میں بسر ہوتی تھیں' اب وہ مسجدوں کے اندر یا اپنے حلقہ دعوت وتبلیغ میں صرف ہوں گی۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ دعوت وتبلیغ کے ذریعے انفرادی زندگیوں میں تبدیلی آئی ہے اور آئے گی' لیکن اس سے نظام نہیں بدلتا جب تک کہ ایک انقلابی تحریک نہ ہو اور اُس کا نقشہ حضور ﷺ کی سیرت سے اخذ نہ کیا جائے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم قول ہے:

لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا

’’اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریقے سے جس سے کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔‘‘

یہی بات ایک حدیث کے حوالے سے بھی سن لیجیے۔ یہ نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے اور مسند احمد بن حنبل میں ہے۔ حضورﷺ نے اپنے دور سے قیامت تک پانچ ادوار گنوائے ہیں:

(۱) پہلا دورِ نبوت ہے۔ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا: مَیں تمہارے درمیان موجود رہوں گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر اللہ مجھے اُٹھا لے گا اور دورِ نبوت ختم ہو جائے گا۔

(۲) پھر ’’خلافت علیٰ منہاج النبوۃ‘‘ کا دور ہے۔ تیس برس تک خلافت عین نبوت کے نقشِ قدم پر قائم رہی۔ بین بین وہی نقشہ' اس میں بال برابر فرق نہیں۔

(۳) پھر کاٹ کھانے والی ملوکیت کا دَور آئے گا۔ ’’مُلْكًا عَاضًا‘‘ یعنی ظالم بادشاہ۔ یہ بنواُمیہ کے بادشاہ ہیں جن کے زمانے میں حضرت حسینؓ اپنے عزیزوں کے ساتھ شہید کیے گئے۔ ’’واقعہ حرہ‘‘ ہوا ہے۔ تین دن کے لیے مدینے کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ اس دور میں سینکڑوں تابعی شہید کیے گئے۔ کہنے کو تو وہ خلفائے بنواُمیہ تھے لیکن درحقیقت یہ کاٹ کھانے والی ملوکیت تھی۔

(۴) اس کے بعد ’’مُلْكًا جَبَرِيًّا‘‘ یعنی غلامی والی ملوکیت کا دور آئے گا۔ عجیب بات ہے کہ ایک دور وہ آ گیا کہ اب ہماری حکمران ملکہ وکٹوریہ تھی۔ پہلے مغل تھے' خلجی تھے' لودھی تھے' سادات تھے' غلامان تھے۔ یہ مسلمان تو تھے اور ان کے زمانے میں قانون تو مسلمانوں کا نافذ تھا۔ مفتی اور قاضی حضرات تھے' جمعہ کا نظام تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت ملوکیت کی غلامی تھی۔

(۵) پھر ’’خلافت علیٰ منہاج النبوۃ‘‘ کا دور آئے گا' اور یقیناً آ کر رہے گا۔

ان احادیث کو ہم نے ایک کتابچہ کی صورت میں ’’نویدِ خلافت‘‘ کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس میں درج احادیث کا مطالعہ بہت ضروری ہے' کیونکہ موجودہ حالات میں ہر مسلمان ڈرا ہوا ہے کہ اسلام کا مستقبل کیا ہے! مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟ اس

وقت پوری دنیا میں مسلمان پِٹ رہا ہے۔ع ’’ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!‘‘ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اے اللہ! ہم کم از کم تیرے نام لیوا تو ہیں ۔ تیرے نبی ﷺ کے شیدائی ہیں۔ ہمارا یہ حال کیوں ہے؟

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!

یہ ہم پر اللہ کا عذاب ہے کہ ہم نے اُس کا دین قائم نہیں کیا‘ جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ (الشوریٰ:۱۳)

’’کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔‘‘

ہم نے تو تم پر لازم کیا تھا کہ ہمارے دین کو قائم کرو اور اس میں باہم متفرق نہ ہونا۔ ’’مذہب‘‘ میں اختلاف ہو جائے‘ کوئی حرج نہیں ہے۔ ہاتھ سینے پر باندھ لو یا ناف پر‘ یا ہاتھ کھول کر نماز پڑھ لو مالکیوں کی طرح‘ کوئی حرج نہیں ہے۔ چند منٹ تاخیر سے روزہ کھول لو تو کیا فرق پڑ جائے گا! البتہ یہ کہ دین ایک ہے۔ حاکم اللہ ہو اور اُسی کا قانون ہو۔ وہی ملکی قانون (law of the land) ہوگا۔ اس کو قائم کرو۔

تنظیم اسلامی کی جدّو جُہد

یہ جو اقامتِ دین کی تحریکیں ہیں‘ ان میں ہمارا بھی حصّہ ہے۔ ہم اسی تحریک کو لے کر چل رہے ہیں ۔اس ضمن میں دوسری دینی جماعتوں یا حلقوں سے جو کوشش ہو رہی ہے‘ ہم اس کی نفی نہیں کرتے ۔ ہر ایک اپنے رنگ میں کوشش کر رہا ہے۔ اسلام کے خلاف جب کبھی کوئی فتنہ کھڑا ہوتا ہے تو دینی مدارس کے علماء سینہ سپر ہو جاتے ہیں! انہی کی قیادت میں ختم نبوت کی تحریک چلی اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ یہ کام بھٹو کے ہاتھوں کروایا گیا۔ البتہ یہ کہ دین کو قائم کرنے کا معاملہ ذہنوں سے اوجھل ہے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اسلام کا تصوّر ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے‘ اسی کو سینوں سے لگا رکھا ہے۔ اللہ کا شکر ہے اور علماء کرام کا پاک و ہند کے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ مذہب کا ادارہ intact رہا۔ مسجدیں بنتی اور آباد ہوتی رہیں‘ علماء تیار ہوتے رہے‘ وگرنہ یورپی استعمار کے دوران

بہت سے مسلمان ممالک میں تو ان چیزوں کی بالکل صفائی ہوگئی۔ حالات بالکل بدل گئے۔

ہماری اس تحریک کے دو حصے ہیں:

(ا) ایک مغالطہ جو ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوگیا ہے‘ اُس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ پہلے دلوں میں یقین والا ایمان پیدا ہو‘صرف زبانی اقرار نہیں۔ ذرا گردن جھکائیں اور اپنے گریبان میں جھانکیں کہ کیا اللہ کی ذات اور صفات پر یقین ہے! مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر اور حساب کتاب پر یقین ہے؟ آخرت کی زندگی پر یقین ہے؟ شریعت پر یقین ہے؟ اگر یقین نہیں ہے تو وہ کام نہیں ہوسکتا جو حضور ﷺ نے کیا۔ کوئی اچھا اور نیک کام ہوسکتا ہے‘ مذہبی اعتبار سے کوئی بہتری آسکتی ہے لیکن دین کو قائم کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے اندر یقین والا ایمان پیدا ہو چکا ہو۔ اس کا منبع اور سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ قرآن کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ نے یقین پیدا کیا ہے۔ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ (الحدید:۹)

’’وہی تو ہے (اللہ) جس نے اپنے بندے پر آیاتِ بیّنات نازل کی ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔‘‘

شرک والحاد‘مادّہ پرستی (materialism)‘منطقیت (logicalism)‘ مثبیت (positiveism)‘ڈارونِ ازم (Darwinism) اور مارکس ازم (Marxism) ان سب اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانے والی چیز اللہ کی کتاب ہے۔ لیکن یہ صرف تلاوت کرنے سے نہیں ہوگا۔ صرف تلاوت سے ثواب تو ملے گا۔ آپ نے وقت نکالا ہے‘ بیٹھے ہیں‘ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ یہی وقت آپ کسی دُنیاوی کام میں لگا سکتے تھے۔ آپ نے اپنا وقت تلاوت کے لیے لگایا ہے‘اس پر اجر وثواب تو ملے گا لیکن اس سے ایمان پیدا نہیں ہوگا۔

ایمان پیدا ہوگا قرآن کو اپنی آنکھ سے اُس کی زبان میں پڑھ کر۔ اپنی آنکھ سے پڑھنے کا مطلب ہے مترجم کی نظر سے نہیں۔ آپ نے آیت پڑھ لی‘ پھر ترجمہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ ترجمہ مترجم نے کیا ہے۔ پھر ترجموں میں اختلافات بھی ہیں۔ قرآن کو اُس کی زبان میں سمجھا جائے اور اپنی آنکھ سے پڑھا جائے تو وہ دل میں یقین پیدا کرتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا اکثر و بیشتر حصّہ خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن کی دعوت دینے میں لگایا ہے کہ قرآن پڑھو‘ عربی سیکھو! ناظرہ قرآن پڑھانے کے بے شمار مدارس ہیں‘ حفظ کے مدارس ہیں‘ لیکن اُن حفاظ میں سے نوے فیصد کو پتا ہی نہیں چلتا کہ ہم نے کیا پڑھا ہے۔ نہ تراویح میں پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کو پتا چلتا کہ ہم نے کیا سنا ہے۔ تراویح میں ثواب تو ملے گا۔ آپ نے محنت کی ہے‘ بیس رکعتیں پڑھیں ہیں۔ لیکن قرآن سے جو استفادہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہو سکا۔ مقصد تو یہ ہے کہ قرآن آپ کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

’’کہو: میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔‘‘

مَیں نے ۱۹۵۰ء میں مولانا مودودیؒ کا پمفلٹ ’’شہادتِ حق‘‘ پڑھا تھا (میں اُس وقت اٹھارہ برس کا تھا)۔ یہ کتابچہ آج بھی موجود ہے۔ آپ بھی اسے پڑھیں‘ جس میں یہ تصوّر دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے:

(۱) خود مسلمان بنے۔

(۲) دوسروں کو اسلام کی دعوت دے۔

(۳) اسلام کو قائم کرنے کی جِدّ و جُہد کرے۔

اور اس کے لیے لازماً ایک جماعت ہونی چاہیے۔

الحمدللہ! اپنے پورے زمانہ طالبِ علمی میں اور اس کے بعد سے آج تک مَیں اس پر عمل پیرا ہوں۔ مجھے جہاں سے اختلاف ہوا وہ یہ کہ الیکشن کی طرف جا کر آپ نے غلطی کی ہے۔ اب آپ ایک سیاسی جماعت بن گئے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں مَیں ایک مضبوط ارادے کے ساتھ لاہور منتقل ہوا تھا کہ جو بھی صلاحیت اللہ نے دی ہے' اس کے بل پر مجھے خود تحریک شروع کرنی ہے۔ پہلے میں انتظار کرتا رہا۔ اُس زمانے میں بعض بڑی شخصیتیں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہوئی تھیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا عبدالجبار غازی' مولانا عبدالغفار حسن (رحمۃ اللہ علیہم)۔ یہ بڑے لوگ تھے۔ شیخ سلطان احمد صاحب تو غالباً ابھی بقیدِ حیات ہیں' اللہ تعالیٰ اُنہیں زندگی اور صحت دے۔ مَیں کوشش کرتا رہا کہ یہ لوگ جس ایشو پر علیحدہ ہوئے ہیں' اُسی پر جماعت بنا لیں لیکن نہیں بنا سکے۔ پھر مَیں نے سوچا کہ ہر ایک کو اپنی قبر میں جانا اور جواب دینا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں اس کام کا آغاز کر دوں۔ ہماری دعوت اور جِدّوجُہد میں ہمارے پیش نظر یہ تدریج ہے:

(۱) قرآن کا پڑھنا پڑھانا

حدیثِ نبویؐ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) کو ہماری دعوت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارا یہ قرآن کو پڑھنا پڑھانا روایتی اور محض حصولِ ثواب کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے اُس پورے انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہے کہ اس کے ذریعے سے پہلے ہمارے اندر انقلاب آئے' یقین والا ایمان پیدا ہو۔ تو قرآن مجید کے ذریعے سے ایمان پیدا کرنے کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی کے لیے ۱۹۷۲ء میں لاہور میں مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور قائم کی گئی۔ پھر انجمن خُدّام القرآن سندھ کراچی قائم ہوئی' وہاں قرآن اکیڈمی بنی۔ پھر ملتان میں قرآن اکیڈمی بنی۔ دیگر جگہوں پر بھی چھوٹی چھوٹی اکیڈیمیز بنیں۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اُس کی اصل زبان عربی میں اپنی آنکھ سے پڑھنے کے قابل ہوں۔ پھر یہ تمہارے اندر اتر جائے گا' جیسے علّامہ اقبال کہتے ہیں: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

جب یہ قرآن کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس شخص کے باطن میں انقلاب آ جاتا ہے۔ پہلے وہ کچھ اور سوچتا تھا' اب کچھ اور سوچتا ہے۔ پہلے زندگی عزیز تھی' اب شہادت کی موت زیادہ عزیز ہے۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اندر کا انقلاب درحقیقت دُنیا میں انقلاب لانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارا قرآن کا پڑھنا اور پڑھانا بھی روایتی نہیں ہے بلکہ ایک خاص مقصد منہجِ انقلابِ نبویؐ کا حصّہ ہے۔ قرآن حکیم میں انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

﴿یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ٭﴾ (الجمعۃ:۲)

’’جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔‘‘

دورِ نبویؐ میں لوگوں کو آیاتِ خداوندی صرف پڑھ کر سنانا کافی تھا کیونکہ سب کی زبان عربی تھی۔ اُس پر درس دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ ہمیں درس دینے کی ضرورت ہے کیونکہ عربی ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ ہم تاکید کرتے ہیں کہ عربی پڑھو تاکہ خود اپنی آنکھ سے دیکھ سکو۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

پھر آپ کے دل پر خود قرآن نازل ہوگا۔

(۲) اپنی ذات پر شریعت کا نفاذ

جن لوگوں کے اندر ایمان کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اُس کا ثبوت ہوگا شریعت پر مکمل عمل۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں شروع میں شریعت نہیں تھی۔ مکّہ میں کیا شریعت تھی؟ پنج وقتہ نماز بھی کہیں گیارھویں سال میں جا کے آئی ہے۔ سود بھی حرام نہیں تھا۔ شراب بھی حرام نہیں تھی۔ وہاں یہ ہوتا تھا کہ کسی نے کہا ’’لَا الٰہ الّا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ‘‘ اور مار پڑنی شروع ہوگئی۔ تربیت تو ہوتی ہی مار کھا کر ہے۔

تُو خاک میں مل اور آگ میں جل، جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

آج شریعت پر عمل کرنے کی صورت میں مار پڑتی ہے۔ گھر کے اندر شرعی پردہ نافذ کیجیے' برادری آپ کا بائیکاٹ کر دے گی۔ سودی معاملہ ختم کرنا چاہیں تو گھر والے آپ کے دُشمن ہو جائیں گے' اور کہیں گے کہ کاروبار کی بساط ہم نے پھیلا رکھی ہوئی ہے بینکوں سے قرضہ لے لے کر' کیا اب وہ ختم کر دیں! اگر ہم سود کی لعنت میں براہِ راست ملوث نہ بھی ہوں تب بھی میرے اور آپ کے اندر اس کا غبار تو جا رہا ہے' جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے: ''ایک وقت آئے گا' کوئی شخص سود نہیں کھائے گا تب بھی اُس کے اندر سُود کا غبار ضرور جائے گا۔''

ہمارا پورا معاشی نظام سود پر ہے۔ گندم کے ہر دانے میں سود ہے۔ اس کے لیے بیج سودی قرضے پر خریدا گیا۔ کھادیں اور کیڑے مار ادویات سودی قرضے پر' ٹریکٹر اور زرعی آلات سودی قرضے پر۔ البتہ ہم یہ تو کر سکتے ہیں کہ سود میں براہِ راست ملوث نہ ہوں کہ اپنی رقم جمع رکھ کر سود کھائیں یا سود لے کر اپنا کاروبار پھیلائیں اور بڑی بلڈنگیں بنائیں۔ وگرنہ پھر اسلامی انقلاب کی بات نہ کرو' اسلام کو بدنام نہ کرو۔

(۳) منظّم جماعت

یہ کام ایک منظّم اور تربیت یافتہ جماعت کے بغیر نہیں ہوگا۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اگر اکیلا آدمی انقلاب برپا کر سکتا تو ہر نبی انقلاب برپا کر کے جاتا۔ نبی تو کامل انسان ہوتا ہے' اُس کی طرف اللہ کی ہدایت مسلسل آ رہی ہوتی تھی' وحی آ رہی ہوتی تھی۔ جب تک منظّم جماعت نہ ہو تو اگلا قدم نہیں اُٹھ سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں انقلاب کا معاملہ قریب آ گیا تھا۔ آپؑ مصر سے چھ لاکھ آدمیوں کو لے کر نکلے تھے' لیکن جب جنگ کا وقت آیا تو انہوں نے کورا جواب دے دیا: ﴿فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ (المائدۃ) ''بس تم اور تمہارا ربّ دونوں جاؤ اور جا کر قتال کرو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔'' بوڑھوں' بچوں اور عورتوں کو نکال دیں تو میرے نزدیک ایک لاکھ ورنہ کم از کم پچاس ہزار افراد تو جنگ کے قابل ہوں گے مگر صرف دو آدمی نکلے۔ حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا۔ اس پر

حضرت موسیٰ نے کہا: اے اللہ! مجھے تو اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی دوسرے پر اختیار نہیں ہے! اس کے برعکس حضورﷺ کو وہ جماعت ملی کہ جہاں آپﷺ کا پسینہ گرا وہاں انہوں نے اپنے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اگر ایسی جماعت نہ ملتی تو یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔

اس حوالے سے آنحضورﷺ نے فرمایا: ((عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ)) (سنن الترمذی) ’’تم پر جماعت کی شکل میں رہنا لازم ہے۔‘‘ جماعت کے بغیر یہ کام نہیں ہوگا۔ وعظ ہوتا رہے گا‘ درس و تدریس ہوتی رہے گی مگر قدم آگے نہیں بڑھے گا۔ سمع و طاعت لازم ہے‘ جس کے لیے حضورﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ‘ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ‘ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا‘ وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ‘ وَعَلٰی اَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا‘ لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (متفق علیه)
>
> ’’ہم نے اللہ کے رسولﷺ سے اس پر بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے‘ خواہ آسانی ہو یا مشکل‘ خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے‘ اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ اور اس بات پر (بیعت کی) کہ ہم اصحابِ اختیار سے جھگڑیں گے نہیں‘ اور اس پر کہ حق بات کہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے‘ اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پروا رہیں گے۔‘‘
>
> نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا   عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا
>
> ’’ہم وہ ہیں کہ ہم نے محمدﷺ سے بیعت کی ہے کہ ہم ہمیشہ (اللہ کی راہ میں) جہاد کرتے رہیں گے جب تک کہ جان میں جان ہے۔‘‘

جماعتی زندگی میں آخری فیصلہ امیر کا ہوگا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء میں بیعت کی بنیاد پر جماعت قائم کی تھی۔ مولانا مودودی نے یہ نظام اختیار نہیں کیا۔ جماعت اسلامی میں وہ دستوری نظام ہے جو آج کی دُنیا میں رائج ہے۔ ممبر شپ ہے اور پھر وہی اراکین اپنا امیر چنتے ہیں۔ چار سال بعد دوبارہ انتخاب ہوتا ہے۔ اسلام میں ان چیزوں کا

ذکر نہیں ہے بلکہ قرآن‘ حدیث اور سیرت میں بیعت کا ذکر ہے۔ ۱۴۰۰ برس تک ہمارے ہاں جو بھی دینی کام ہوئے ہیں‘ وہ بیعت کی بنیاد پر ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے۔

کرنے کا کام

جو حضرات بھی قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے عمل سے وابستہ ہیں وہ اُس کا اپنا ہدف سامنے رکھیں‘ ورنہ بات وہی ہو جائے گی کہ ع آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف! پھر یہ بھی بس اک مشغلہ اور شغل ہو جائے گا۔ کچھ لوگ ہیں جو کوئی اور زبان پڑھ رہے ہیں‘ کوئی جرمن زبان پڑھ رہے ہیں‘ کوئی فرانسیسی زبان پڑھ رہے ہیں‘ ہم عربی پڑھ رہے ہیں۔ اس کے اندر سے کچھ نہ کچھ اسلامی باتیں مل جاتی ہیں۔ اس کا ہدف اور مقصد کیا ہے؟ ﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۳) ’’یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو!‘‘ دین کو قائم کرنے کی جِدّ و جُہد کے لیے وہ لوگ چاہئیں جن کے اندر یقین والا ایمان ہو۔ اس کے لیے پہلے قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا ضروری ہے۔ پھر اُن کو بیعت کے نظام کے تحت منظّم کیا جائے گا۔ جب طاقت کافی ہو جائے تو پھر میدان میں آ کر باطل کے نظام کو چیلنج کرنا ہوگا۔ یہ چیلنج یعنی دوطرفہ جنگ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟﴾ (التوبۃ:۱۱۱)

’’وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں‘ پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔‘‘

غزوۂ بدر میں ستّر مشرکین مارے گئے اور ۱۴ صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے۔ غزوہ اُحد میں ستّر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔

آج کے زمانے میں اپنے ملک کے اندر سے نظام باطل کو ہٹانے کے لیے جو کوشش ہو گی اس کے لیے ایک منظّم (disciplined) جماعت عوامی تحریک لے کر میدان میں آئے‘ پھر پیچھے نہ ہٹے۔ اس کا مطالبہ ہو کہ سارے حرام کام بند کیے جائیں۔ اس معاملے میں کچھ جماعتوں سے غلطی ہو رہی ہے۔ یہ کام اُس پیمانے پر کرنے کا نہیں ہے۔ پہلے

آپ ایک ملک گیر جماعت بنائیں‘ جس کے اندر اتنی طاقت ہو کہ وہ کھڑی ہو کر چیلنج کر سکے۔ جیلوں کو بھر سکے۔ پھر ایک ایسا عوامی سیلاب آتا ہے جس کی وجہ سے یوکرین‘ جارجیا اور لاطینی امریکہ میں انقلاب آیا‘ جس کے نتیجے میں نیپال کے بادشاہ کو جھکنا پڑا‘ جس کے نتیجے میں کرغستان میں انقلاب آیا۔ عوام کا ایک بہاؤ‘ عوام کا ریلا اُٹھے جو اسلام کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو چکے ہوں۔ اِس کو علّامہ اقبال نے دو اشعار کے اندر بڑی خوب صورتی سے سمو دیا ہے۔ کیسی عجیب کیفیت اور کیسے عالَم میں اُنہوں نے یہ اشعار کہے ہیں۔ علّامہ اقبال اللہ تعالیٰ سے اپنی ایک گفتگو بیان کر رہے ہیں:

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!

اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا: اے اقبال! ہم نے تمہیں اپنی جس دنیا میں بھیجا ہے آیا وہ تمہارے ساتھ سازگار ہے؟ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں‘ مجھے پسند نہیں! یہاں ظلم ہے‘ یہاں غریب پس رہا ہے۔ یہاں کے حالات تو یہ ہیں ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے اور جاگیرداروں کے ظلم وستم سے دہقان کی کھیتی خراب ہے۔ اس کے بچے بھوکے ہیں اور اس کی کھیتی سے ان کی غذا کا اہتمام نہیں ہو رہا ؎

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

اقبال کہتے ہیں کہ جب میں نے کہا کہ مجھے تیرا یہ جہان پسند نہیں‘ یہ میرے لیے سازگار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’’برہم زن!‘‘ یعنی اسے توڑ پھوڑ دو‘ درہم برہم کر دو! یہاں انقلاب برپا کر دو!!

اب اس انقلاب کا طریق کار کیا ہو؟ اسے اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا

ہے۔ پہلے مصرعہ میں چار مراحل اور دوسرے میں دو مراحل بیان کیے ہیں ؎

با نشّۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلے درویشی کی روش اختیار کرو اور اپنا کام کرتے رہو۔ دعوت وتبلیغ میں لگے رہو۔ کوئی پاگل کہے یا کوئی گالی دے تو اُسے جواب میں دعا دو۔ کوئی پتھر مارے تو اُسے پھول پیش کرو۔ اور جب تیار ہو جاؤ یعنی تعداد بھی کافی ہو‘ ٹریننگ بھی صحیح ہو چکی ہو‘ ڈسپلن کے بھی پابند ہو جائیں اور ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم کے ساتھ ٹکرا دو۔ اس ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ ٹکراؤ اور تصادم کے الفاظ بہت سے لوگوں کو اچھے نہیں لگیں گے‘ لیکن حضور ﷺ نے جو دین قائم کیا تھا اس کے بغیر تو نہیں ہوا۔ اسلام دین ہے۔ اس کو غالب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اس کے لیے یقین والا ایمان درکار ہے جس کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس کے لیے قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور عربی سیکھنا سکھانا ہوگی۔ اس کے بعد ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں وہ ایمان‘ جذبہ اور اُمنگ پیدا ہو جائے‘ اُنہیں مضبوط نظم جماعت کے اندر کسنا اور پھر اسی کام کو جاری رکھنا ہے‘ تا آنکہ اتنی قوت ہو جائے کہ آپ نظامِ باطل کو میدان میں آ کر للکار سکیں۔ میں نے اپنی دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک تیسری کتاب بھی بڑی اہم ہے: ’’نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت‘‘۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو کس لیے بھیجا گیا تھا: ﴿لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ؕ﴾ (الفتح:۲۸) ’’تا کہ اس دین کو کل ادیان پر غالب کر دیں۔‘‘ میرا وہ مقالہ آپ حضرات پڑھیے‘ ان شاء اللہ تعالیٰ بات مزید واضح ہو جائے گی۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَات

(ترتیب وتسوید: شاہد عمران‘ محمد خلیق)

❁❁❁

عفو و درگزر

مرکزی شعبۂ تربیت تنظیم اسلامی

محترم رفقائے گرامی! اسلام جہاں ایک اجتماعی وفلاحی نظام ہے‘ وہیں یہ ایک روحانی اور اصلاحی نظام بھی ہے۔ اسلام اُن تمام پہلوؤں سے انسان کی راہنمائی کرتا ہے جن میں اس کے لیے دین و دنیا اور آخرت کی بہتری اور بھلائی ہے۔ چونکہ اسلام پوری انسانیت کا دین ہے‘ لہٰذا وہ تمام انسانوں کو اجتماعیت میں پرونا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں زندگی گزارنے کے اعلیٰ اصول سکھائے گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دین و دنیا کی بھلائی حاصل کریں۔ ان اعلیٰ اصولوں میں سے ایک عفو و درگزر ہے۔ یہ صفت اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان بیان کی گئی ہے:

﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝۴۴﴾ (بنی اسرائیل)

’’بے شک وہ بہت بردبار اور معاف کرنے والا ہے۔‘‘

غزوۂ احد کے موقع پر چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی اجتہادی غلطی سے فتح شکست میں بدل گئی۔ حضور اکرم ﷺ بھی زخمی ہوئے اور ستر صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے۔ اتنے بڑے نقصان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران آیت ۱۵۲ اور ۱۵۵ میں ان کے لیے ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ﴾ اور ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ﴾ کے واشگاف الفاظ میں معافی کا اعلان کر دیا۔

عفو کا مفہوم

عفو کے لفظی معنی ہیں: مٹانا‘ بچنا اور فالتو ہونا۔ شریعت کی اصطلاح میں عفو سے مراد ہے: کسی کی زیادتی اور بُرائی کو انتقام کی قدرت کے باوجود معاف کر دینا اور انتقام نہ لینا۔ دوسروں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنا۔ دوسروں کی غلطیوں کو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود صرف اس لیے معاف کر دینا تاکہ رضائے الٰہی حاصل ہو سکے۔

فضیلت واہمیت

اسلامی اخلاقیات میں عفو کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ حلم اور تحمل کا ایک عملی مظہر ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کی غلطیوں اور خطاؤں کو معاف نہیں کریں گے تو اجتماعی نظام فساد کا شکار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وصف کو بہت بڑے بڑے اخلاقی اوصاف میں شامل کیا ہے اور قرآن کریم میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ جب غُصّہ کی حالت میں ہو تو معاف کر دیا کرو۔

جن خوش خصال اور پاکیزہ صفت بندوں کے لیے جنّت آراستہ کی گئی ہے‘ سورۂ آلِ عمران میں ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ﴾ (آیت ۱۳۴)

''غُصّہ کو پی جانے والے اور لوگوں (کی زیادتی یا قصور) کو معاف کر دینے والے۔''

غُصّہ کی حالت میں معاف کر دینا انتہائی کشادہ دلی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان انتقام نہ لے سکتا ہو تو معاف کر دے‘ کیونکہ وہ تو سراسر کمزوری ہے۔ معاف کرنا یہ ہے کہ انتقام اور بدلہ لینے کی طاقت ہو اور پھر معاف کر دے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ (البقرۃ:۲۳۷)

''اور یہ کہ تم اگر درگزر کرو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

ایک اور جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ؁﴾ (الاعراف)

''(اے نبی ﷺ!) آپ درگزر کا رویہ اپنایئے اور بھلی بات کا حکم دیتے رہیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔''

ایک داعیٔ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں‘ ان میں سے ایک اہم صفت یہ ہے کہ اسے نرم دل‘ متحمل مزاج اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اسے اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق‘ عام لوگوں کے لیے رحم دل اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اسے اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی

کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ سخت گیری‘ درشت خوئی‘ تلخ گفتاری اور اشتعال والی عادات دعوت کے کام میں زہر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے کام بنتا نہیں ہے بلکہ بگڑتا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر ؓ بیان کرتے ہیں: میری رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ مَیں نے آپؐ سے ہاتھ ملانے میں پہل کی۔ پھر مَیں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے سب سے افضل عمل بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے عقبہ! جو تم سے قطع تعلق کرے‘ اس سے تعلق جوڑو۔ جو تمہیں محروم کرے‘ اسے عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے‘ اس سے درگزر کرو (ایک روایت میں ہے: اس کو معاف کرو)۔‘‘ (مسند احمد: ۱۷۴۵۲)

حضرت علی ؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’جو تم سے تعلق توڑے اس سے تعلق جوڑو اور جو تم سے برا سلوک کرے اس سے اچھا سلوک کرو‘ اور حق بات کہو خواہ وہ تمہارے خلاف ہو۔‘‘ (الجامع الصغیر: ۷۲۱۷)

انصاف کے ساتھ ظلم کا بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے‘ لیکن فضیلت اور عزیمت یہی ہے کہ بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود محض اللہ کے لیے معاف کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ (آیت ۴۰) میں فرمایا گیا:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾

’’اور بُرائی کا بدلہ اس کی مثل بُرائی ہے (یعنی جس درجے کی زیادتی کسی نے کی‘ اس کے بدلہ میں اس کے ساتھ اسی درجہ کی زیادتی کی قانونی اجازت ہے) لیکن جو کوئی (انتقام نہ لے اور) معاف کر دے اور صلح و اصلاح کی کوشش کرے تو اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔‘‘

ویسے تو عفو و درگزر ایک ایسا اخلاقی وصف ہے جو ہر مؤمن میں ہونا چاہیے اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں عام طور پر اس کا اظہار ہونا چاہیے‘ لیکن ملازمین اور ماتحتوں کے ساتھ ایسا رویہ خصوصی طور پر پسندیدہ عمل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا کہ ہم خدمت گاروں کے قصور کتنی مرتبہ معاف کیا کریں؟ آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس نے اپنی بات کو دہرایا تو بھی آپ ﷺ خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ اس نے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((اُعْفُ عَنْهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعِينَ مَرَّةً)) (سنن الترمذی)

’’اُس کو ہر روز ستر مرتبہ معاف کیا کرو۔‘‘

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا: اے پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزّت ہیں؟ ارشاد ہوا: ’’وہ بندے جو (قصوروار پر) قابو پانے کے بعد (اور سزا پر قدرت رکھنے کے باوجود) اس کو معاف کر دیں۔‘‘ (شعب الایمان للبیہقی)

حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس نے اپنی زبان کو (لوگوں کی پردہ دری سے) روکے رکھا‘ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اور جس نے اپنے غصّہ پر قابو پایا‘ اللہ اپنے عذاب کو اس سے روک دے گا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے حضور (اپنی خطاؤں پر) معافی کا طلب گار ہوا‘ اللہ تعالیٰ اس کی معافی قبول فرمائے گا۔‘‘ (شعب الایمان)

تکبّر کی ایک صورت

اب ایک دوسرے پہلو سے بھی عفو و درگزر کے معاملہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ آج کل معافی بھی مشروط ہوتی ہے۔ یعنی کہنے والا کہتا ہے: ’’اگر میری بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔‘‘ اس کا واضح مطلب ہے کہ وہ اپنی بات کی صحت پر اصرار کر رہا ہے۔ ہر سننے والے اور پڑھنے والے کو واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کر رہا بلکہ اُسے مخاطب کے فہم کا قصور قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا اس طور کی معافی انسانی گھمنڈ کی عکاس ہے۔ معافی اسے کہتے ہیں جب انسان اپنی غلطی کا اعتراف کرے‘ اس پر نادم اور شرمندہ ہو‘ اس کے لیے کوئی عذر نہ تراشے اور غیر مشروط طور پر معافی مانگ لے۔ اس طور سے معافی مانگنا قابلِ تحسین ہے اور ایسے شخص کی معافی قبول کرنا شریعتِ مطہرہ کی نظر میں پسندیدہ امر ہے۔

وکیل بن الجراح کہتے ہیں: سفیان ثوری بیمار پڑ گئے تو مَیں نے ان کی عیادت میں تاخیر کر دی۔ پھر میں ان کی عیادت کو آیا اور تاخیر پر معذرت کی تو انہوں نے کہا: ’’بھائی! معذرت نہ کرو‘ بہت سے معذرت کرنے والے جھوٹ بولتے ہیں۔ جان لو دوست سے کوئی حساب طلبی نہیں ہوتی اور دشمن سے خیر کی توقع نہیں ہوتی۔‘‘

ندامت: توبہ کے لیے شرط

ابتدائے آفرینش میں ہمارے سامنے دو مثالیں ہیں۔ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنّت میں داخل کیا تو اس کی بابت قرآن کریم بیان فرماتا ہے:

﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنّت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو کسی روک ٹوک کے بغیر کھاؤ‘ ہاں! اس (خاص) درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے انہیں اُس درخت کے بارے میں پھسلایا اور اُن کو اُس جگہ سے نکلوا دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا: تم سب اُترو‘ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اور تمہارے لیے اب زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔ پھر آدم نے اپنے رب سے (توبہ کے) کلمات سیکھ لیے تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان ہے۔‘‘

اُن کلماتِ توبہ کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (الاعراف)

’’ان دونوں نے عرض کی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی‘ اور اگر تُو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

الغرض حضرت آدم و حوا علیہما السلام نے اپنی خطا کو تسلیم کیا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے غیر مشروط معافی مانگی تو ان کی توبہ قبول فرمائی گئی۔

اس کے برعکس شیطان نے بھی آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے ازراہِ تکبّر و استکبار اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی‘ تو اللہ تعالیٰ نے اُس سے بھی جواب طلبی فرمائی:

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾﴾ (الاعراف)

’’فرمایا: جب مَیں نے تجھے (آدم کو سجدہ کرنے کا) حکم دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس

چیز نے روکا؟ ابلیس نے کہا: مَیں اُس سے بہتر ہوں' تُو نے مجھے آگ سے اور اُسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

ابلیس نے اپنے جوہرِ تخلیق کو افضل قرار دیتے ہوئے آدم علیہ السلام پر اپنی برتری ظاہر کی' منطق اور دلیل کا سہارا لیا' اللہ تعالیٰ کے حکم کو بے چون و چرا تسلیم نہ کیا اور یوں قیامت تک کے لیے راندۂ درگاہ اور ملعون قرار پایا۔ پس اپنی خطا کو تسلیم کر کے غیر مشروط طور پر معافی مانگنا آدمیت ہے اور آدم علیہ السلام کی سُنّت ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کو قصداً تسلیم نہ کر کے اس کا جواز پیش کرنا اور عقلی دلیل کا سہارا لینا ابلیس کا وتیرہ ہے۔

آج کا مسئلہ یہی ہے کہ لوگ اپنی غلطی کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر کے معافی مانگنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کا عُجب واستکبار انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ بودے دلائل کا سہارا لے کر اپنے نفسِ امّارہ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ یہی شعار تمام خرابیوں کی جڑ ہے' جبکہ آدمیت عجز و انکسار کا نام ہے۔ غلطی کو تسلیم کر کے اس کا ازالہ کرنا شِعارِ آدمیت ہے' افتخارِ آدمیت ہے' وسیلۂ نجات ہے۔ اسی سے بغض وعداوت اور نفرتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر تین افراد (حضرت کعب بن مالک' حضرت ہلال بن اُمیہ اور حضرت مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم) کے علاوہ لگ بھگ اَسّی افراد کسی معقول عذر کے بغیر جان بوجھ کر جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے۔ واپسی پر صرف مذکورہ بالا تینوں صحابہؓ نے واضح طور پر غیر مشروط اپنی غلطی کا اعتراف کیا' شرمندہ ہوئے اور توبہ کی یعنی اپنی غلطی پر معافی مانگی۔ لہٰذا ان تینوں صحابہ رضی اللہ عنہم کے پچاس روزہ معاشرتی بائیکاٹ کے بعد توبہ قبول بھی ہوگئی۔ اس کا ذکر سورۃ التوبہ میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ﴾

''اور ان تین پر بھی (اللہ نے رحمت کی نگاہ کی) جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود ان پر تنگ پڑ گئی اور ان پر ان کی اپنی جانیں بھی بوجھ بن گئیں اور انہیں یقین ہوگیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ ہے ہی نہیں۔ تو اُس نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ بھی پھر متوجہ ہو جائیں۔ یقیناً اللہ بہت توبہ قبول

کرنے والا‘ بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے۔‘‘

باقی تمام منافقین نے صرف بہانے بنائے اور جھوٹی معذرتیں کرتے رہے‘ نہ تو اپنی غلطی تسلیم کی اور نہ ہی معافی مانگی۔

دوسری طرف جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہ کرے حالانکہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہو‘ اپنی غلطی پر شرمندہ بھی ہو‘ ایسے شخص کے لیے احادیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت جودان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

’’جس نے اپنے بھائی کے سامنے (اپنی کسی غلطی پر) معافی مانگی اور اس نے یہ معافی قبول نہ کی تو اس پر ایسا ہی گناہ ہوگا جیسے ٹیکس کی وصولی میں خیانت یا زیادتی کرنے والے پر ہوتا ہے۔‘‘ (سنن ابن ماجہ)

اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صِدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

’’تم پاک دامنی اختیار کرو تاکہ تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں۔ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو تاکہ تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اور جو (اپنی کسی غلطی پر) اپنے مسلمان بھائی سے معافی مانگے اور وہ اس کو قبول نہ کرے تو وہ میرے حوض (کوثر) پر نہیں آئے گا۔‘‘ (المعجم الاوسط)

معافی: صرف ذاتی معاملات میں

یہاں یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی کا قصور معاف کرنے کی اس فضیلت کا تعلق افراد واشخاص اور ان کے ذاتی ونجی حقوق ومعاملات سے ہے‘ لیکن جو جرائم حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور اللہ کی طرف سے ان پر سزا مقرر ہے‘ انہیں معاف کر دینے کا اختیار کسی کے پاس نہیں ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو دنیا میں سب سے زیادہ رحم دل تھے‘ آپؐ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ اپنے قصورواروں کو ہمیشہ کے لیے معاف کر دیتے تھے لیکن اللہ کی حدود کو پامال کرنے والوں کو شریعت کے مطابق ضرور سزا دیتے تھے۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ذاتی معاملے میں کبھی کسی کو کوئی سزا نہیں دی لیکن جب کوئی اللہ کی حدود کو توڑتا تو آپؐ اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سزا دیتے تھے۔

سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے بھی ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اخلاق کی تلوار اور عفوودرگزر کی ڈھال سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مکی

زندگی عفو و درگزر کی بہترین مثال ہے۔ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے قتل کی سازش کی‘ آپ ؐ نے ان کے لیے دعائیں کیں۔ جنہوں نے آپ ﷺ کو لہولہان کیا‘ آپ ﷺ نے انہیں دین رحمت کی دعوت دی اور جنّت کی بشارت ان کے سامنے رکھی۔ فتح مکّہ کے بعد جب حضور اکرم ﷺ کا اپنے دشمنوں پر غلبہ ہوگیا اور انتقام لینے کی پوری قدرت حاصل ہوگئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: آج مَیں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ((﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ اِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) ’’آج تم لوگوں پر کوئی ملامت (کوئی باز پُرس‘ کوئی مواخذہ نہیں‘ کوئی سرزنش) نہیں۔ اللہ تمہیں معاف فرمائے‘ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔‘‘ جاؤتم سب آزاد ہو!‘‘

رحمتِ دو عالَم ﷺ کے اس کریمانہ سلوک کا قریشِ مکّہ پر یہ اثر ہوا کہ ان کے دل و دماغ سے کفروشرک کا زنگ آناً فاناً دور ہوگیا۔ وہ اسلام اور داعیٔ اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام کی بیعت کرنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔

یہ بات بھی ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ دعوتِ دین اور تبلیغ میں حکمت کے جو چند اصول بیان کیے گئے ہیں‘ عفو و درگزر ان میں سے ایک ہے۔ سخت اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ ہر طرح کی ناگوار باتوں کو بھی اعلیٰ ظرفی کے ساتھ نظر انداز کر دینا چاہیے۔ سورۃ آلِ عمران میں حضور اکرم ﷺ کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں ہدایت دی گئی:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ ﴾ (آیت ۱۵۹)

’’پس آپؐ ان کو معاف کر دیجیے اور ان کے لیے استغفار کی دعا کیجیے اور معاملہ میں ان سے مشورہ کیجیے۔‘‘

یعنی دین کے راستے میں ایک داعیٔ حق کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ساتھیوں کی کمزوریوں کو نہ صرف معاف کر دیا کرے بلکہ ان کے لیے استغفار کی بھی دعا کرے اور ان کی کمزوریوں کے باوجود ان کو مشورے میں شریک بھی رکھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی عفو و درگزر اور حِلم و بُردباری جیسی اعلیٰ اقدار سے نوازدے۔ ہماری بھی غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمادے۔ آمین یاربّ العالمین!

❀❀❀

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مثالی اندازِ تعلیم

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ کی زندگی بنی نوعِ انسان کے ہر فرد کے لیے نمونہ ہے۔ کوئی شخص کسی بھی پیشے سے منسلک ہو‘ اُسے رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے کامل راہ نمائی مل سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ’’یقیناً رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے!‘‘

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’مَیں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں۔‘‘ (مجمع الزوائد) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ (البقرۃ) ’’اے ہمارے ربّ! ان ہی میں سے ایک رسول ان کی طرف مبعوث فرما جو ان کے لیے آپ کی آیات تلاوت کرے‘ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے‘ اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً آپ تو بڑے زبردست اور حکمت والے ہیں۔‘‘ اس دعا کا مصداق محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں‘ اس لیے کہ حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں صرف نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ ہی مبعوث ہوئے۔ پھر اس دعا کی قبولیت کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں دی: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ﴾ (الصّف) ’’اے بنی اسرائیل! مَیں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں‘ مَیں تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے آ چکی ہے یعنی تورات اور ایک پیغمبر کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہو گا۔‘‘

دعائے خلیلؑ ونویدِ مسیحاؑ‘ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہر اعتبار سے انسانیت کے لیے کامل نمونہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر کام انتہائی خوبصورت

اور مثالی (ideal) انداز میں کیا۔ کتاب کی تعلیم دینا آپؐ کے فرضِ منصبی میں شامل تھا اور آپؐ نے اس فرض کی ادائیگی بھی بڑے مثالی انداز میں کی۔ بطورِ نمونہ رسول اللہ ﷺ کے اندازِ تعلیم کے چند پہلوؤں کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ آپؐ کا اندازِ تعلیم کس قدر خوبصورت اور جامع ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کے لیے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا تھا' بلکہ جب بھی آپؐ مناسب سمجھتے تو تعلیم دیتے۔ نمازِ عشاء کے بعد آپؐ گفتگو کو ناپسند فرماتے' تاہم اگر ضروری ہوتا تو آپؐ اُس وقت بھی اہم باتوں کے بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''تم یہ رات دیکھ رہے ہو' آج جو لوگ زمین کی پشت پر موجود ہیں' سو سال پورے ہو جانے پر ان میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔'' (صحیح بخاری' کتاب العلم)

بعض اوقات سامع کی فرمائش پر رسول اللہ ﷺ اپنی بات کو دُہرا دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوسعید! جو اس بات پر راضی ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اُس کا ربّ ہے' اسلام اُس کا دین ہے اور محمد ﷺ اُس کے نبی ہیں تو اُس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔'' اس بات سے خوش ہو کر ابوسعید نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ بات دوبارہ فرما دیجیے' چنانچہ آپؐ نے یہ بات دوبارہ کہہ دی۔ (صحیح مسلم' کتاب الامارہ)

تعلیم کے لیے آپ ﷺ صرف منبر ہی استعمال نہیں کرتے تھے' بلکہ ہر اُس جگہ آپؐ تعلیم دیتے جہاں مناسب سمجھتے۔ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مرد ہی آپؐ کی ساری باتیں لے گئے۔ آپؐ ہمارے لیے بھی ایک دن مخصوص کر دیجیے کہ اس میں ہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور جو کچھ اللہ نے آپؐ کو سکھایا ہے' اس میں سے ہمیں بھی کچھ سکھا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فلاں دن' فلاں جگہ تم سب اکٹھی ہو جانا۔'' وہ عورتیں مقررہ جگہ پر جمع ہو گئیں تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھایا تھا' اُس میں سے انہیں سکھایا۔ (صحیحین' عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ)

جہاں اور جس وقت بھی کسی بات کے بارے میں آپ ﷺ سے استفسار کیا جاتا تو آپؐ بلاتکلّف اس کا جواب ارشاد فرماتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ سوال کرنے والوں کے لیے منیٰ میں رکے تو ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ بے خبری میں مَیں نے ذبح کرنے سے پہلے سر منڈا لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی حرج نہیں' اب ذبح کر لو!'' ایک دوسرا شخص آیا اور کہنے لگا کہ مَیں نے بے سمجھی میں رمی سے پہلے ذبح کر لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب رمی کر لو' کوئی حرج نہیں!'' اسی طرح کسی نے آگے پیچھے کیے گئے کام کے متعلق آپؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کچھ مضائقہ نہیں' اب کر لو۔'' (صحیح بخاری' عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما)

رسول اللہ ﷺ کی تواضع وانکساری کا یہ عالَم تھا کہ آپؐ تعلیم دیتے وقت بھی اپنی حیثیت کو نمایاں نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ آپ ﷺ کا مقام انتہائی ارفع تھا' تاہم آپؐ دوسروں کو ہرگز کمتر نہیں جانتے تھے اور نہ ہی اپنے لیے کوئی نشست مخصوص کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر سے آنے والے کو پوچھنا پڑتا کہ رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔ آپ ﷺ کو یہ بات انتہائی ناپسند تھی کہ صحابہ کرامؓ آپؐ کی خاطر اُٹھ کر کھڑے ہوں۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی شخص عزیز نہیں تھا' لیکن جب صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کو آتا دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے' کیونکہ انہیں اس بارے میں آپؐ کی ناپسندیدگی کا علم تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف مبعوث فرمایا تو آپؐ وصیت کرتے ہوئے ان کے ساتھ نکلے۔ اس وقت معاذؓ سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ سواری کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل' عن معاذ بن جبلؓ) اس روایت سے ایک طرف آپ ﷺ کی تواضع کا اظہار ہوتا ہے' تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ کس قدر بے تکلّف تھے۔ نیز یہ کہ ہر موقع پر آپؐ اپنے عمل سے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مَیں رسول اللہ ﷺ کی سواری کو چلائے جا رہا تھا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے عقبہ کیا تم سوار نہیں ہو گے؟'' مَیں نے آپؐ کے احترام کے پیشِ نظر آپؐ کی سواری پر چڑھنے کو اچھا نہ سمجھا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا:

’’اے عقبہ! کیا تم سوار نہیں ہو گے؟‘‘ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میرے انکار سے آپؐ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ سواری سے نیچے تشریف لائے اور مَیں تھوڑی دیر کے لیے سوار ہو گیا۔ پھر مَیں نیچے اُترا اور رسول اللہ ﷺ سواری پر سوار ہو گئے اور فرمایا: ’’عقبہ! کیا مَیں تمہیں تورات‘ انجیل‘ زبور اور قرآن پاک میں اتری ہوئی تمام سورتوں سے بہترین سورتیں بتاؤں؟‘‘ مَیں نے کہا: جی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے معوّذتین پڑھائیں (سنن نسائی‘ عن عقبہ بن عامرؓ)۔ گویا عقبہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ خود سوار ہوں اور رسول اللہ ﷺ پیدل چلیں‘ مگر جب آپؐ نے تکرار سے کہا تو وہ سوار ہو گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے اصحاب کو کس قدر عزّت واحترام دیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ آپؐ ہر چھوٹے بڑے اور عام و خاص کے سوال کا جواب دیتے تھے۔ ایک موقع پر سفر کے دوران ایک بدو آپؐ کے سامنے آیا اور اس نے آپؐ کی اونٹنی کی لگام تھام لی۔ پھر کہنے لگا: ’’اے محمد ﷺ! مجھے وہ بات بتلایئے جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور جہنم سے دور کر دے!‘‘ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رک گئے اور آپؐ نے اس بدو سے کہا: ’’اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو‘ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ‘ نماز قائم کرو‘ زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔‘‘ آخر میں آپ نے اس بدو سے کہا کہ اب اونٹنی چھوڑ دو تو اس نے لگام چھوڑ دی۔ (صحیح مسلم عن ابی ایوب رضی اللہ عنہ)

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ (النجم: ۳) ’’اور وہ اپنی خواہش نفس کے تحت بات نہیں کرتے‘ بلکہ وہ وہی بات بتاتے ہیں جو اُن کی طرف وحی کی جاتی ہے‘‘۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ سے کسی ایسی بات کے بارے میں سوال کیا جاتا جو آپؐ نہ جانتے ہوتے تو آپؐ خاموش رہتے یا کہہ دیتے کہ مَیں نہیں جانتا اور وحی کا انتظار فرماتے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں بیمار ہوا تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ میری عیادت کی خاطر پیدل چل کر میرے پاس تشریف لائے۔ آپؐ کی تشریف آوری کے وقت مجھ پر بے ہوشی طاری تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا تو مجھے کچھ افاقہ ہوا۔ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ! مَیں اپنے مال کے بارے میں کس طرح فیصلہ کروں‘ یعنی میراث کیسے تقسیم کروں؟ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول

اللہ ﷺ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا‘ یہاں تک کہ میراث کی آیت نازل ہوئی۔(صحیحین‘ عن جابر بن عبداللہؓ)

رسول اللہ ﷺ کی تعلیم شفقت اور راحت کا نمونہ ہوتی تھی۔ غلطی کرنے والے کو محبت کے ساتھ سمجھاتے تھے جس کا اچھا نتیجہ ظاہر ہوتا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں موجود تھے کہ ایک بدو آیا اور اُس نے کھڑے ہو کر مسجد میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ نے اس کو فوراً کہا: رک جاؤ‘ رک جاؤ! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کو نہ روکو‘ اسے چھوڑ دو۔‘‘ انہوں نے اسے چھوڑ دیا‘ یہاں تک کہ اس نے پیشاب کر لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا: ’’بیشک یہ (مسجدیں) اللہ عزّوجل کے ذکر‘ نماز اور قراءتِ قرآن کے لیے ہوتی ہیں۔‘‘ پھر آپ ﷺ نے لوگوں میں سے ایک شخص کو حکم دیا‘ وہ پانی کا ایک ڈول لایا اور اس نے اس (پیشاب) پر بہا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا عمدہ اخلاق دیکھ کر بدّو نے بطور تشکر کہا: ’’میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔‘‘ (صحیح مسلم‘ کتاب الطہارۃ)

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں بچپن میں رسول اللہ ﷺ کی زیرِ تربیت تھا۔ کھانا کھانے کے دوران میرا ہاتھ برتن میں گھوم رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اے میرے بچے! بسم اللہ پڑھو‘ دائیں ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔‘‘ (متفق علیہ)
یتیم اور کمزور بچے کو اس قدر پیار‘ محبّت اور اُلفت کے ساتھ پکارنا اور پھر اُسے کھانے کے آداب سکھانے کا کتنا پیارا انداز ہے۔

ایک موقع پر کچھ بدوی لوگ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تو حجرے کے باہر سے ہی آپؐ کو آوازیں دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات اچھی نہ لگی تو اس کے بارے میں یہ حکم نازل فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴﴾ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡہِمۡ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ﴾ (الحجرات:۵) ’’(اے نبی ﷺ!) جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔ اور اگر وہ صبر کیے رہتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔‘‘ اسی طرح جب آپ ﷺ کو اس طرح پکارا گیا جس طرح لوگ آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح پکارنے کو بھی ناپسند کیا اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات بھی بُری لگی کہ آپ کی

محفل میں بیٹھا ہوا کوئی شخص آپؐ کی آواز سے بلند آواز میں بات کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ناراضگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ (الحجرات) ''اے اہلِ ایمان اپنی آواز پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو!''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی تادیب کی خاطر بعض مواقع پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مثلاً حضرت جابر ؓ بیان کرتے ہیں کہ مَیں اپنے والد کے ذمہ ایک قرض کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مَیں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''کون ہے''؟ مَیں نے کہا: ''مَیں!'' اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مَیں مَیں!'' گویا آپؐ نے اس جواب کو ناپسند فرمایا (صحیحین عن جابرؓ)۔ کون ہے کے جواب میں ''مَیں'' کہنا مناسب نہیں تھا' بلکہ پوچھنے پر دروازہ کھٹکھٹانے والے کو اپنا نام بتانا چاہیے تھا۔ یہ ادب آپ ﷺ نے پوری اُمّت کو سکھایا۔

غیر ضروری سوال پوچھنے کو بھی رسول اللہ ﷺ نے ناپسند کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے' لہٰذا تم حج کرو!'' ایک شخص نے کہا: ''کیا ہر سال؟'' آپ ﷺ خاموش رہے' یہاں تک کہ اُس شخص نے اپنی اس بات کو تین دفعہ دہرایا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر مَیں کہہ دیتا ''ہاں'' تو (ہر سال حج کرنا) فرض ہو جاتا اور تم اس کی استطاعت نہ رکھتے۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً تم سے پہلے لوگ کثرتِ سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔ پس جب مَیں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت اس پر عمل کرو اور جب مَیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے رُک جاؤ!'' (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ) اس طرح آپ ﷺ نے غیر متعلق' نامناسب اور فضول سوال کرنے کو اچھا نہ جانا اور مناسب تنبیہ کر دی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور خاص طور پر معلمین اور اساتذہ کرام کو رسول اللہ ﷺ کے اندازِ تعلیم کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

❁❁❁

اقبال کا مردِ مؤمن

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اپنے کلام کے طول وعرض میں ابتدائی صفات سے تکمیلی اوصاف تک کی حامل جس شخصیت کا بار بار ذکر کرتے ہیں‘ اُسے وہ ’’مردِ مؤمن‘‘ کہتے ہیں۔ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

یہی وہ مردِ مؤمن ہے جس کو وہ کبھی ’’مردِ خدا‘‘، کبھی ’’مردِ قلندر‘‘، کبھی ’’بندۂ مؤمن‘‘، کبھی ’’مردِ مسلمان‘‘ اور کبھی ’’مردِ درویش‘‘ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنی نظم ’’مسجدِ قرطبہ‘‘ میں وہ اس ’’مردِ خدا‘‘ کا ذکر بایں طور کرتے ہیں ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات‘ موت ہے اس پر حرام

تُند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اِک سیل ہے‘ سیل کو لیتا ہے تھام

ہاتھ ہے اللہ کا‘ بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں‘ کارکُشا‘ کارساز

’’مردِ مؤمن‘‘ کے بارے میں ان کے مزید اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ تخت و تاج میں‘ نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اور ؎

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

اور ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

مشہور یونانی حکیم دیو جانس کلبی کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لیے کسی مردِ کامل کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ مولانا رومی بیان کرتے ہیں کہ کل شیخ چراغ لیے شہر میں گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ مَیں جانوروں‘ حیوانوں اور درندوں سے تنگ آ گیا ہوں‘ مجھے کسی انسان کی آرزو اور تلاش ہے۔ ان بیکار اور نکمّے ہمراہیوں سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا ہے اور مجھے شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ ؓ اور رستمِ داستان (مشہور ایرانی پہلوان) جیسے جری و دلیر انسانوں کی جستجو ہے۔ مَیں نے کہا کہ ایسا انسانِ کامل تو تلاشِ بسیار کے باوجود مل نہیں رہا‘ تو اُس نے جواب دیا کہ جو مل نہیں رہا مجھے دراصل اُسی کی آرزو اور تلاش ہے۔ ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رُستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشوَد جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشوَد آنم آرزوست!

اقبالؒ کو بھی ایک ایسا جامع الصفات کامل انسان چاہیے۔ یہ مردِ مؤمن کن کن صفات سے متصف ہے‘ اس غرض کے لیے کلامِ اقبالؒ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

(ا) کائنات کے ہمہ گیر تصوّر کا حامل

ایک باشعور اور سنجیدہ انسان جب اپنے آپ پر‘ کائنات پر‘ انسانی ذرائع علم پر‘ موجودات کے تنوع پر اور دمادم پھیلتی کائنات کی لامحدود وسعتوں پر غور وفکر کرتا ہے تو اُس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات کا ایک حصّہ بے شک ہمارے علم وحواس کی گرفت میں ہے مگر اس کا ایک دوسرا حصّہ وہ ہے جہاں تک صرف علم بالحواس کے ذریعے ہماری رسائی ممکن نہیں۔ کائنات کے ان دونوں حصّوں کو اہلِ دانش وبینش نے مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مشہور مصنف

بریڈلے اسے "Reality & Appearance" کے دو خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ برٹرینڈرسل اسے "Knowledge of Things" اور "Knowledge of Facts" سے تعبیر کرتا ہے۔ بعض دوسرے محققین اسے "The Unseen World" کہتے ہیں۔ قصہ مختصر‘ ہماری اس ظاہری اور شہودی دنیا کے ساتھ ایک غیبی اور روحانی دنیا بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس غیبی دنیا کو سمجھنے کے لیے اللہ کی شناخت وصفات‘ آخرت کے تصوّر اور انسان کے روحانی وجود کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان روحانی حقائق کی تفہیم کے لیے انسان کے مادّی وجود میں ایک روحانی آلہ نصب کیا گیا ہے‘ جس کا نام ’’قلب‘‘ ہے۔ یہ قلب اگر صاف وشفاف اور زندہ و بیدار ہو تو انسان کو غیبی و روحانی دنیا سے مسلسل متعلق و مربوط رکھتا ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں: ؎

دم چیست پیام است شُنیدی نشنیدی!\
در خاکِ تُو یک جلوہَ عام است! ندیدی\
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

یعنی سانس کیا ہے؟ یہ انسان کے زندہ ہونے کا ایک پیغام اور ثبوت ہے‘ خواہ تم اس کی آمد و رفت کی آواز سنو یا نہ سنو۔ جب ہم کسی کے زندہ ہونے کا یقین کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ ہم اس کے سانس کی آمد و رفت کی آواز سنتے ہیں‘ بلکہ ہم جسم پر سانس کے اثرات کو دیکھتے ہیں اور انسان کے زندہ ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تمہارے خاکی وجود میں ایک روحانی مرکز ہے جس میں روحانی سانس کی آمد و رفت جاری ہے‘ جو اگرچہ تمہیں نظر نہیں آتا مگر اس کی وجہ سے روحانی دنیا کے ساتھ تمہارا ربط وضبط رہتا ہے۔ مادّی آنکھوں اور مادّی کانوں سے تو تم دیکھنا اور سننا سیکھ چکے ہو‘ اب روحانی آنکھوں اور کانوں سے باطنی طور پر دیکھنا اور سننا سیکھو!

اس حقیقت کو علّامہ اقبالؒ کے پیر مولانا روم ایک اور دل نشین انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دو دنیاؤں کے حوالے سے ہمارے پاس دو قسم کے حواس ہیں: مادّی اور روحانی۔ مادّی حواس کے ذریعے ہم روزمرّہ کی مادّی دنیا کے ساتھ ربط وضبط رکھتے ہیں‘ جبکہ روحانی حواس کے ذریعے ہم روحانی دنیا کے ساتھ متصل ہیں۔ مادّی حواس کو طاقت ور اور توانا رکھنا چاہتے ہیں تو مادّی وجود کو اعلیٰ غذاؤں کے ذریعے موٹا تازہ اور فربہ رکھو۔ روحانی حواس کو صحت منداور بیدار رکھنا چاہتے ہو تو ایک طرف روحانی وجود کو اعلیٰ وارفع روحانی غذائیں کھلاؤ اور دوسری جانب مادّی جسم و بدن کو مشقتوں سے گزارو۔ مادّی وجود بیمار پڑ جائے تو ڈاکٹر کے

پاس جانا پڑے گا۔ اگر روحانی وجود پر بیماری کا حملہ ہو جائے تو روحانی طبیب سے استفادہ کرنا پڑے گا‘ جو حبیبِ کبریا یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

حِسِ دُنیا نردبانِ ایں جہان حِسِ دینی نردبانِ آسمان
صحتِ ایں حِس بجوئید از طبیب صحتِ آں حِس بخواہید از حبیبؐ
صحتِ ایں حِس ز معموریٔ تن صحتِ آں حِس ز تخریبِ بدن

اقبالؒ مردِ مؤمن کے لیے دعا کرتا ہے کہ اسے زندہ و بیدار دل کی دولت عطا کر‘ جس میں وہ معرفتِ رب اور اطاعتِ الٰہی کی آرزو پال سکے۔ اگر وہ حرم کا راستہ بھول گیا ہے تو اُسے نئے سرے سے نشانِ منزل دکھا دے۔ مسلمان اپنی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی کی وجہ سے مادّی دنیا کا خوگر بن کر رہ گیا ہے‘ اسے صاف اور شفاف قلب کی بدولت روحانی دنیا کا حسین و روح پرور منظر دکھا۔ جس طرح قیامت پرانی دنیا کے مٹنے اور نئی دنیا کے ظہور کا نام ہے اسی طرح مسلمان کے دل پر قیامت برپا کر‘ تاکہ ایک زندہ و بیدار دل وجود میں آجائے۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمان کے دل میں خدا کی محبت جلوہ افروز تھی‘ مگر اب مسلمان کا دل اس سے خالی ہو گیا ہے۔ یااللہ! ایک بار پھر اپنے جود و کرم سے دلِ مؤمن کو اپنی محبّت عطا کر۔

یا رب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے جو قلب کو گرما دے‘ جو روح کو تڑپا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سُوئے حرم لے چل اِس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے

مادّہ پرستانہ اور محدود تصوّرِ حیات کی بابت اقبالؒ کہتے ہیں کہ اصل نگاہ تو وہ ہے کہ انسان دل کی روشنی سے حقائق کو دیکھ سکے۔

نگاہ وہ نہیں جو سُرخ و زرد پہچانے نگاہ وہ ہے کہ محتاجِ مہر و ماہ نہیں

کائنات کے اسی محدود تصوّر اور حسی نقطہ نگاہ کا ذکر علامہ اقبال اپنی فارسی تصنیف ’’زبورِ عجم‘‘ میں تہذیبِ مغرب کی مثال دے کر کرتے ہیں کہ فرنگی فکر اس محسوس کائنات کی ہیئت سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو چکی ہے۔ اُس کی روحانی آنکھ اندھی ہو چکی ہے اور وہ رنگ و بُو کے اس ظاہری تماشا میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔

فکرِ فرنگ پیشِ مجاز آورد سجود
بینائے کور و مستِ تماشائے رنگ و بُوست

اور ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نُور دل کا نُور نہیں

اور ؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے‘ اِسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

اقبالؒ بندۂ مؤمن کو خوشخبری سناتے ہیں کہ دنیا علم بالحواس کی جس تنگنائے میں پھنس چکی ہے‘ مؤمن کے لیے اس سے آگے لذّت وشوق کے مقامات ہیں۔ ؎

علم کی حد سے پرے‘ بندۂ مؤمن کے لیے
لذّتِ شوق بھی ہے‘ نعمتِ دیدار بھی ہے

مظاہرِ کائنات کی چکاچوند میں محویت اور اللہ سے دوری اور محجوبیت کا یہی حادثہ فاجعہ ہے جس پر مولانا رومیؒ ظاہر پرست انسان کو ہدایات دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مادّی اشیاء کو تو حیوان کی نگاہیں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اگر انسان کی نگاہیں بھی صرف انہی مادّی اشیاء کو دیکھنے لگیں تو پھر انسان کا وہ کمال کیا ہے جس کی بنا پر قرآن (بنی اسرائیل:۷۰) میں اُس کا ذکر ﴿وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ...﴾ (اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزّت بخشی ہے) کے الفاظ میں کیا گیا۔ صرف ظاہر کو دیکھنا ابلیس کا شیوہ اور ابلیسی نگاہ ہے‘ جس نے آدمؑ کی صرف ظاہری خاکی صورت کو دیکھا اور کہا کہ مَیں ناری ہوں اور خاکی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اُس کی ظاہر بین نگاہ آدم کے خاکی وجود میں مستور روحانی وجود کو دیکھنے سے قاصر رہی۔ رومیؒ کہتے ہیں: اے ظاہر بین انسان! اپنے اندر کی اس ابلیسی آنکھ کو ایک لمحہ کے لیے بند کر دے۔ تُو کب تک ان ظاہری صورتوں کا دل دادہ بنا رہے گا! کائنات میں کسی واقعہ کے جو ظاہری اسباب نظر آ رہے ہیں‘ اگر دل کی آنکھ سے دیکھو تو ان کے پیچھے اصل سبب ’’اللہ‘‘ موجود ہے۔ ؎

نور آں دانی کہ حیوان دید ہم — پس چہ کرّمنا بوَد بَر آدم
چشمِ ابلیسانہ را یک دم بہ بند — چند بینی صورتِ آخر چند چند
ہست بر اَسباب اَسبابے دگر — در سبب منگر در آں افگن نظر

قرآن نہایت واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اگرچہ یہ کتاب بِالقُوّۃ (potentially) تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اُتری ہے‘ مگر بالفعل اس ہدایت ربّانی سے

وہ خوش نصیب مستفید ہوں گے جو اِس مادّی کائنات اور حسی تصوّرِ حیات کی تنگ گھاٹی سے بلند ہو کر ایک وسیع و عریض کائناتی تصوّر کے مالک بن چکے ہوں۔ قرآن کی زبان میں اس حقیقت کا نام ''ایمان بالغیب'' ہے۔

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾﴾

﴿ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ﴾

(۲) عظمتِ انسانی کا نقیب

اقبالؒ کے نزدیک مردِ مؤمن نہ تو صرف خاکی وجود کا حامل ہے اور نہ ہی وہ محض عقل کا پتلا ہے' بلکہ اسی خاکی وجود کے اندر ایک نورانی وجود بھی رکھتا ہے۔ اپنی دماغی صلاحیت کے بَل بوتے پر مردِ مؤمن ایک جانب عقل وفکر کی جولانیاں دکھاتا ہے تو دوسری طرف اپنے نورانی وجود کے طفیل وہ آسمان پر کمند ڈال رہا ہے۔ ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں　　غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

گویا مردِ مؤمن اگر عقلی و دماغی صلاحیت واہلیت کی بنا پر صاحبِ ادراک ہے تو اپنی نورانیت کی بنیاد پر ذوقِ تجلّی کا آشنا بھی ہے۔ اسی نورانی وجود کی بنا پر مردِ مؤمن مسجودِ ملائک بھی ہے اور حاملِ وحی بھی۔ خلیفۃ اللہ فی الارض بھی ہے اور اللہ کے اعزازی عطا ﴿وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ …﴾ کا مستحق بھی۔ پھر قرآن کے تین مقامات پر اسے روحِ ربانی کا مہبط قرار دیا گیا ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اسے ﴿لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ﴾ (جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا) کا عظیم شرف بخشا۔ ؎

اس پیکرِ خاکی میں اِک شے ہے' سو وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اُس شے کی نگہبانی

اور ؎

نقطۂ نوری کہ نامِ اُو خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

''وہ نورانی نقطہ جس کا نام خودی (روح) ہے میرے خاکی وجود کے اندر زندگی کا شعلہ ہے۔''

اور ؎

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گُم است　　ایں گوہرے کہ گم شُدہ مائیم یا کہ اوست!

’’میرے خاکی وجود کے اندر روحانی زندگی کا ہیرا گُم (چھپا پڑا) ہے۔ جو ہیرا یا گوہر چھپا ہوا ہے یہ مَیں ہوں یا اللہ آ کر میرے دل میں جلوہ افروز ہو گیا ہے!‘‘

اقبالؒ مردِ مؤمن سے کہتا ہے کہ اگرچہ تُو ظاہراً مادّی ہے‘ مگر باطناً تمہارا اصل جوہر نورانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تُو نگاہِ فلک میں دور سے چمک رہا ہے۔ یہی نورانی وجود تمہیں فرشتوں سے بھی آگے بڑھنے کا اعزاز بخشتا ہے۔ ؎

ترا جوہر ہے نُوری‘ پاک ہے تُو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تُو

مولانا رومیؒ کہتے ہیں: ؎

تو بہ تن حیوان بہ جانی از مَلک تا روی ہم بر زمین ہم بر فلک

یعنی تم ظاہری جسم و بدن کے لحاظ سے حیوانوں سے مشابہ ہو‘ مگر اپنے نورانی اور روحانی وجود کی وجہ سے فرشتوں سے جا ملے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم زمین پر بھی چلتے پھرتے ہو اور آسمان پر بھی تمہاری آمد و رفت ہے۔

(۳) کمالی صفات کا مجموعہ

(ا) فقر: اقبالؒ کا مردِ مؤمن صفت ِفقر کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ ہے۔ وہ آب و گِل کی اس دنیا کے ساتھ بقدرِ حاجت و ضرورت ہی جُڑا رہتا ہے۔ زخارفِ دنیا کے ساتھ غیر ضروری انہماک سے پرہیز ہی اُس کے اندر راہِ ہدایت کو دیکھنے والی نگاہ اور زندہ و بیدار دل پیدا کرتا ہے۔ یہ فقر نورِ خودی کے ذریعے اللہ اور راہِ راست دونوں تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

چیست فقر اے بندگانِ آب و گِل یک نگاہ راہ بین یک زندہ دل

اور ؎

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را بیند از نورِ خودی اللہ را

اور ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!
کسے نہیں ہے تمنّائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

اور ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

اور ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

اور ؎

اِک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری
اِک فقر سے کھلتے ہیں اَسرارِ جہانگیری
اِک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اِک فقر سے مٹّی میں خاصیّتِ اکسیری

(ب) <u>توکّل و اعتماد:</u> اقبال کے مردِ مؤمن کی نگاہ مخلوق سے گزر کر خالق اور ظاہری و مادّی اسباب وعلل سے اوپر اُٹھ کر مسبّب الاسباب پر ہوتی ہے۔ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اقبالؒ طارقؒ بن زیاد کی شخصیت میں ہمیں مردِ مؤمن کی ایک جھلک دکھاتا ہے، جنہوں نے دریا کو پار کرنے کے بعد کشتیاں جلا کر اسباب کے بجائے مسبّب الاسباب پر اپنے حتمی اور قطعی توکّل و اعتماد کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ کشتیاں جلانے کے بعد فوج کے اندر یہ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ عقل وخرد کی نگاہ میں تو یہ کوئی دانش مندانہ فعل نہیں ہے۔ پھر شریعت بھی سبب اور ذریعہ کو اپنے ہاتھوں منقطع کرنا جائز وروا نہیں سمجھتی۔ اس پر طارق بن زیاد مسکرائے اور تلوار میان سے نکالتے ہوئے کہا کہ ہر وہ ملک درحقیقت ہماری ملکیت ہے جو خدا کی ملکیت ہے۔ ؎

طارق چو بر کنارۂ اُندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تُو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب زِروئے شریعت کُجا رواست!
خندید ودستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر مُلک مِلکِ ماست کہ مِلکِ خدائے ماست

مولانا رومیؒ کہتے ہیں: ؎

جملہ قرآن ہست در قطعِ سبب　　　عزّ درویش و ہلاکِ بُولہب

یعنی پورا قرآن حکمِ شریعت سمجھ کر اَسبابِ ظاہری کو اختیار کرنے مگر کُل کا کُل توکّل واعتماد صرف اور صرف اللہ کی ذات پر کرنے کے بارے میں اُترا ہے۔ توکّل و اعتماد کا یہی توحیدی نقطہ نظر ابولہب جیسے ظاہر پرست کو ناکام و نامراد کرتا اور خدا پرست درویش کو مقامِ اعزاز بخشتا ہے۔

(ج) آیاتِ الٰہی کا نگہبان: مردِ مؤمن خدا کی زمین پر اُس کی نشانی ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی دید سے اللہ کی عظمت و جبروت کا نقش دکھائی دیتا اور اُس کے فکر سے آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مردِ مؤمن سر سے پاؤں تک‘ قول سے فعل تک‘ فکر سے عمل تک اور انفرادیت سے اجتماعیت تک احکامِ الٰہی اور آیاتِ الٰہی کا نگہبان ہوتا ہے۔ وہ صبغت اللہ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ ؎

تجھ سے ہوا آشکار بندہ مؤمن کا راز
اُس کے دنوں کی تپش‘ اُس کی شبوں کا گداز
ہاتھ ہے اللہ کا‘ بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں‘ کارکُشا‘ کارساز
خاکی و نوری نہادٗ بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل‘ اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دل فریب‘ اُس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو‘ گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو‘ پاک دل و پاک باز

ایک اور مقام پر مردِ مؤمن کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے: ؎

ہر لحظہ ہے مؤمن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں‘ کردار میں‘ اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اُس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے‘ حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان‘ قیامت میں بھی میزان

(۴) تسخیرِ کائنات کی جستجو

اقبال کے نزدیک مردِ مؤمن چونکہ اس کائنات کے محسوس اور غیر محسوس دونوں رُخوں کو ایک کُلّی حقیقت کے طور پر دیکھ رہا ہے‘ اس لیے تسخیرِ کائنات کا اصل مردِ مؤمن ہی ہے اور اسی کے کام کو مکمل تسخیر کہا جا سکتا ہے۔ جو فرد صرف مادّی اور محسوس کائنات ہی کو کُل سمجھتا ہے وہ اپنی تحقیق اور تسخیر و جستجو میں خواہ کتنی ہی جان کاہی سے کام لے‘ مگر چونکہ وہ کُل کائنات و موجودات کے صرف ایک حصے کی تسخیر ہے لہٰذا آدھی اور ادھوری ہے۔ اقبالؒ ایک جانب اگر اہل نظر و تحقیق کے کام کو سراہتا ہے تو دوسری جانب اصحابِ علم و دانش کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف بھی کراتا ہے کہ تحقیق و جستجو بے شک کرو مگر کُل کی حیثیت سے پوری کائنات کی جستجو کرو‘ نہ کہ صرف کائنات کے محسوس اور مادّی رُخ کی تحقیق: ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اقبال بتاتا ہے کہ مردِ مؤمن اپنے ظاہری جسم و بدن کے اعتبار سے ایک محسوس مادّی حقیقت ہے مگر دو وجوہات کی بنا پر وہ غیر محسوس و ناقابلِ دید دنیا کا بھی فاتح ہے۔ ایک یہ کہ وہ صرف محسوس دنیا کو دیکھنے کے حواس نہیں رکھتا بلکہ اپنے روحانی وجود کی وجہ سے غیر محسوس تک رسائی کا ملکہ بھی رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ مردِ مؤمن صرف مادّی کائنات ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتا بلکہ غیر مادّی کائنات پر بھی کمند پھینکتا ہے۔ وہ بلاشبہ ایک خاکی وجود رکھتا ہے‘ مگر چیلنج آسمان کو کرتا ہے۔ وہ زمینی پرندوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتا‘ بلکہ جبرائیل و اسرافیل سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مؤمن　　اَفلاک سے ہے اُس کی حریفانہ کشاکش
جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مؤمن　　جچتے نہیں کنجشک وحمام اُس کی نظر میں

اقبالؒ اپنی فارسی تصنیف ''پیامِ مشرق'' میں تسخیرِ کائنات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ اور مردِ مؤمن کے مابین ایک مکالمہ پیش کرتے ہیں۔ مردِ مؤمن اللہ کے حضور عرض کرتا ہے کہ آپ نے تخلیقِ انسان و کائنات کے ساتھ ہی میری فکری‘ عملی اور تسخیری تربیت کے لیے بعض مسائل و مشکلات بھی پیدا کیے تاکہ ان کو حل کرنے کے لیے مَیں سوچ بچار کروں۔ اس طرح مجھ میں غور و فکر اور تلاش وجستجو کی صلاحیت پیدا ہو اور میرے اندر موجود قوتِ تسخیر کو جلا مل جائے۔ آپ نے تاریکی پیدا کی جس نے میرے سامنے سوال کھڑا کر دیا کہ اس کو روشنی سے کیسے بدلوں! مَیں نے گہرے غور وفکر اور تسخیری جذبے سے چراغ ایجاد کیا اور اس کی روشنی سے تاریکی کا پردہ پھاڑ دیا۔ آپ نے مٹّی بنائی۔ میرے پاس کھانے پینے کے لیے برتن نہیں تھے تو مَیں نے آپ ہی کی عطا کردہ قوتِ تسخیر کے ذریعے مٹّی سے پلیٹ اور پیالہ بنالیا۔ آپ نے بیابان‘ کہسار اور کانٹے دار جھاڑیاں بنائیں تو مَیں نے قوتِ تسخیر سے ان کو خیابان‘ گلزار اور باغ میں تبدیل کر دیا۔ مَیں وہ ہوں جس نے پتّھر سے آئینہ بنا ڈالا۔ آپ نے جب کڑوا زہر پیدا کیا تو مَیں نے میٹھا شربت بنایا۔ ؎

سفال آفریدی‘ ایاغ آفریدم　　تو شب آفریدی‘ چراغ آفریدم
خیابان و گلزار و باغ آفریدم　　بیابان و کہسار و راغ آفریدی
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم　　من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

مردِ مؤمن اپنی تسخیرِ مہر و مہ کے دوران ستاروں کو گردِ راہ کی طرح پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے۔ ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی‘ مکیں آنی‘ ازل تیرا‘ ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو‘ جاوداں تُو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے!

اور ؎

در دشتِ جنونِ من‘ جبریلِ زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

اقبالؒ کے نزدیک ایک ایسے وسیع النظر اور بندۂ مولا صفات کے ہاتھوں ہی سے تسخیرِ کائنات کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ ؎

جہاں تمام ہے میراث مردِ مؤمن کی　　　مرے کلام پہ حُجت ہے نکتۂ لولاک

اور ؎

عالَم ہے فقط مؤمنِ جانباز کی میراث　　　مؤمن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

(۵) یقین و عمل کا حسین امتزاج

ایمان و اسلام سے تعارف کے بعد مردِ مؤمن کا فکری و عملی سفر رُک نہیں جاتا بلکہ مسلسل ترقی کے منازل طے کر کے ایک طرف یقین اور دوسری جانب عمل اور جہاد تک ممتد ہو جاتا ہے۔ اس اِجمال کی تفصیل کو بیج کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بیج بونے کے بعد دوطرفہ سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک سفر کا رُخ نیچے کی طرف جبکہ دوسرے کا رُخ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ بیج بونے کے کچھ ہی عرصہ بعد جڑ نکلنا شروع ہو جاتی ہے‘ جس کا رُخ نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زمین کی گہرائیوں میں پھیلنا شروع کر دیتی ہے۔ بیج کا دوسرا حصّہ اوپر کی جانب اُٹھنا اور بڑھنا شروع کر دیتا ہے‘ جس کو ہم تنا کہتے ہیں۔ ایک مردِ مؤمن ’’ایمان‘‘ کی شکل میں جو بیج دل کی زمین میں بوتا ہے وہ بھی دوطرفہ سفر کے ذریعے عروج وارتقا کی منازل طے کرتا ہے۔ نیچے کی جانب یہ ایمانی بیج دل کی زمین میں اُترتا اور گہرائیوں میں نفوذ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ یقین کی کیفیت ہے۔ اوپر کی جانب یہ تنے کی شکل میں بڑھتا اور شاخوں کی صورت میں اردگرد کے ماحول میں اپنے لیے جگہ بناتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں ایمانی بیج کی اس اوپری اور خارجی بڑھوتری کا نام جہاد ہے۔ ایک مردِ مؤمن نفس و شیطان سے کشمکش کے ساتھ ساتھ جب معاشرے کے غلط رسوم و رواج سے بھی لڑتا ہے تو گویا اپنے ماحول پر چھاتا اور اپنا وجود منواتا ہے۔ پھر دعوتِ دین کے ضمن میں اُس کا یہ جہاد اسلام مخالف اور لادینی نظریات سے ٹکراؤ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سربکف ہو کر میدانِ جہاد میں اُترتا ہے۔ دل میں ایمان کے بیج نے اوپر کی جانب جہاد کی شکل

میں جو سفر شروع کیا تھا‘ اس مرحلہ پر وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں‘ یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

نظم ’’طلوعِ اسلام‘‘ کے چند منتخب اشعار ؎

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبّت فاتحِ عالَم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

یقیں اَفراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

اور ؎

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

تا خلافت کی بِنا دُنیا میں ہو پھر اُستوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اَسلاف کا قلب و جگر

اور ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

(۶) کائنات کی انقلابی ہستی

اقبال کے نزدیک مردِ مؤمن کا مقصدِ وجود احتسابِ کائنات ہے۔ وہ زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ یہ خلافت اس بات کی متقاضی ہے کہ اُسے زمین کے جس حصّہ میں بھی جبر‘ ناانصافی‘

ظلم، عدوان، حق تلفی اور بے جا استحصال نظر آئے تو اُسے مٹانے اور اس کی جگہ حق و عدل اور انصاف و مساوات کو قائم کرنے کی سرتوڑ جِدّ وجُہد کرے۔ چنانچہ اپنی فارسی تصنیف ''زبورِعجم'' میں اقبال ایک مکالمہ پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اقبالؒ کے مابین ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اقبالؒ سے پوچھتا ہے: کیا میری دنیا کا نظام اور اس کے صبح شام تمہارے لیے راس اور سازگار ہیں؟ کیا مختلف شعبہ ہائے حیات میں عدل اور انصاف ہو رہا ہے؟ لوگوں کو ان کے حقوق مل رہے ہیں؟ اقبال نفی میں جواب دیتے ہیں کہ عدل وانصاف کی صورتحال انتہائی مخدوش اور تشویش ناک ہے جس کی وجہ سے مَیں اس ظالمانہ اور غیر منصفانہ نظام میں ناخوش اور بے قرار و مضطرب ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس غیر عادلانہ اور استحصالی نظام کو ایمانی طاقت سے توڑ ڈالو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور تقویٰ و درویشی کے ذریعے اپنی تعمیرِ خودی کرلو۔ جب سیرت و کردار کے حوالے سے خوب مضبوط ہو جاؤ تو اپنے آپ کو وقت کے ظالمانہ نظام پر دے مارو!

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!
با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

اور ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو! کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو!
مَیں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لیے مٹّی کا حرم اور بنا دو!

''زبورِعجم'' ہی میں اقبالؒ مردِ مؤمن کو ظلم اور ستم کے استحصالی نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ سرمایہ دار ایک ظالم اور خونخوار درندہ بن کر غریب و بے نوا

مزدور کی رگوں سے خون کشید کر رہا ہے۔ اسی خونِ رگِ مزدور سے لعل و جواہر کے خزانے سمیٹتا اور شراب و کباب کی محفلیں جما رہا ہے۔ ظالم اور بے حس سرمایہ دار کے اس ظلم کا سیدھا سادا علاج ''انقلاب'' ہے۔

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

واعظ مسجد میں بیٹھ کر وعظ پلا رہا ہے جبکہ اُس کا بیٹا کالج میں داخل ہو گیا ہے جہاں لادینی نصاب اُس کے اندر سے جہاد اور انقلاب کے جذبات نکال رہا ہے۔ ایک طرف واعظ عاقل‘ بالغ اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ایک نامعقول کام میں مشغول ہو کر بچہ بن رہا ہے جبکہ دوسری جانب اُس کا بیٹا دل سے جہاد و انقلاب کے جذبات نکلنے کے بعد جوان کے بجائے جذبات سے خالی بوڑھا بن گیا ہے۔ اقبال دہائی دیتا ہے کہ ایک انقلابی ضرب سے اس نظامِ باطل کے تار و پود بکھیر دو۔

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

آخر میں اقبالؒ کہتا ہے کہ میں دورِ جدید کے ملحدانہ نظامِ تعلیم اور لادینی نظریات کے اندر علم اور آگہی کے نام سے وہ خطرناک زہر دیکھ رہا ہوں کہ اگر اسے ایک سانپ کے وجود میں داخل کیا جائے تو وہ بھی درد و کرب سے پیچ و تاب کھانے لگ جائے گا۔ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!
واعظ اندر مسجد و فرزندِ اُو در مدرسہ
آں بہ پیری کودکے‘ ایں پیر در عہدِ شباب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!
من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

❁❁❁

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ”شعبہ تحقیق اسلامی“ (IRTS)
کے زیرِ انتظام ابلاغِ عامہ وافادۂ عام کی ویب سائٹس

- www.tanzeemdigitallibrary.com بانیٔ تنظیم وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دروس، خطابات وتصنیفات کا جملہ تحریری مواد یونی کوڈ کے سرچ ایبل فارمیٹ (Unicode searchable format) میں دستیاب ہے۔

- www.giveupriba.com انسدادِ سود کی کوششوں کے ضمن میں جملہ معلومات، تاریخی پس منظر، عدالتی فیصلے، قرآن وسنت کے حوالہ جات، معروف تفاسیر کے اقتباسات اور شرق وغرب کے نامور مفکرین کے اقوال وتحریرات اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

- www.hafizahmedyar.com پروفیسر حافظ احمد یارؒ (سابق مدرس پنجاب یونیورسٹی وقرآن اکیڈمی لاہور) کا علمی خزانہ، قرآن مجید کی صرفی ونحوی ترکیب، بلاغتِ قرآن وآڈیو تفسیرِ قرآن اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

پاکستانی سیاست کے دو اہم اَدوار---- ذوالفقار علی بھٹو اور
جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت---- کے دوران
بانیٔ تنظیم اسلامی کے فکر انگیز اور بصیرت افروز سیاسی تجزیوں
اور حالاتِ حاضرہ پر تبصروں کے انتخاب پر مشتمل کتاب

جدا ہو دیں سیاست سے....!

۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۴ء کے سیاسی تجزیے

از

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

سفید کاغذ | عمدہ طباعت | مضبوط جلد

صفحات: 296 | قیمت: 600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

0301-111 53 48 maktaba.com.pk

Email:maktaba@tanzeem.org

Feb. 2023
Vol.72

Regd. CPL No.115
No.2

Monthly **Meesaq** Lahore